
سعادت حسن منٹو
لاؤڈ سپیکر

○ منٹو تو ادب کے علاوہ عمر بھر اپنی زندگی میں فن کاری کے شعبدے دکھاتا رہا۔ شراب بے تحاشہ پیتا رہا۔ مقدمے اس پر چلے۔ پاگل خانے تک جا پہنچا۔ برصغیر میں ادب کا جو "انڈر ورلڈ" ہے اس کا وہ عمدہ مصور تھا۔ تعجب ہے کہ اس کو Toudaure-Lautrec سے کیوں تشبیہ نہیں دی گئی۔

قرۃ العین حیدر

○ میں اُسے واحد ایسا ادیب اور افسانہ نگار سمجھتا رہا ہوں جس میں فن اور زبان کا برابر امتزاج ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

○ منٹو!...... خدا تیرے قلم میں اور زہر بھر دے!

کرشن چندر

○ اگر مستقبل میں کوئی غیر جانب دار نقاد منٹو اور مشرق وسطیٰ کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تجزیہ کرنے بیٹھے گا تو بخدا منٹو کو پاکستان اور ہندوستان ہی کا نہیں پورے مشرقِ وسطیٰ کا سب سے بڑا فن کار قرار دینے پر مجبور ہوگا۔

رشید اختر ندوی

○ منٹو اپنے سوا کسی کو شاذ ہی مانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتے تھے۔ ان کا دعویٰ کسی حد تک درست تھا۔

شورش کاشمیری

○ منٹو اگر الگ ہے تو کوئی جماعت لوگوں کی نظر میں ادیبوں کی نمائندہ نہیں بن سکتی۔

محمد حسن عسکری

○ منٹو اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے جو ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ممتاز شیریں

لاؤڈ اسپیکر

سعادت حسن منٹو

ساقی بک ڈپو

LOUD SPEAKER
-Saadat Hassan Manto

ISBN 81-85772-11-8

نام کتاب : لاؤڈاسپیکر
مصنف : سعادت حسن منٹو
اشاعت : ۲۰۰۵ء
طابع : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی ـ ۳۲
قیمت : اسّی روپے (Rs.80/=)

ناشر
ساقی بُک ڈپو
4157-A اردو بازار، دہلی ـ 110006

SAQI BOOK DEPOT
4157A, Urdu Bazar, Delhi- 110006

چراغ حسن حسرت

کے

نام

عنوانات

نوٹ:

اس مجموعے میں منٹو نے نور جہاں پر بھی مضمون شامل کیا تھا، یہ مضمون منٹو کے دوسرے مجموعے 'شیطان' میں شائع ہو چکا ہے۔ 'نور جہاں سرورِ جاں' پڑھنے کے لئے "شیطان" ملاحظہ فرمائیں۔

دیوان سنگھ مفتون

لُغت میں 'مفتون' کا مطلب عاشق بیان کیا گیا ہے۔ اب ذرا اِس عاشقِ زار کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔ ناٹا قد۔ بھدا جسم۔ اُبھری ہوئی توند۔ وزنی سر جس پر چھدرے کھچڑی بال جو کیس کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں۔ اکٹھے کیے جائیں تو مشکل کسی کشتر برہمن کی چوٹی بنے۔ گہرا سانولا رنگ۔ چھوٹی سی گھسی پٹی داڑھی جو شاید کسی زمانے میں داڑھیوں کی لاج رکھتی ہو۔ آنکھیں بڑی نہ چھوٹی۔ مگر بلا کی تیز اور مضطرب۔

بحیثیتِ مجموعی یہ عاشق زار، سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ہفتہ وار "ریاست" دہلی۔ کسی زمانے میں راجاؤں، مہاراجوں اور نوابوں کا دشمن۔ ان کے راز فاش کرنے والا اخبار۔ صحافت میں ایک سنگ تھے، قلم مگر بہت نددعد

انداز تحریر کا مالک، دوستوں کا دوست بلکہ خادم اور دشمنوں کا ظالم ترین دشمن۔
چلن ٹائر کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس اشتہار میں جو ٹائروں
کی بنی ہوئی انسان نما شکل ہے، اُس کے جوڑوں میں درد نہیں ہوتا مگر دیوان سنگھ
مفتون گٹھیا کا مارا ہے۔ اُس کا بند بند اور جوڑ جوڑ درد کرتا ہے ——— آپ
اُس کے میز پر قلم دوات کے ساتھ ہر وقت کروشن سالٹ کی بوتل دیکھ سکتے ہیں۔
یہ قلم دان کا ایسا جزو بن کے رہ گئی ہے کہ بعض اوقات آپ کو ایسا معلوم
ہوگا کہ دیوان سنگھ اپنا قلم روشنائی میں ڈبونے کے بدلے کروشن سالٹ میں ڈبوتا
ہے اور اُسی سے لکھتا ہے۔

جس طرح دیوان سنگھ مفتون کی کوئی کل سیدھی نہیں، اسی طرح اُس کی
تحریر کا کوئی جملہ سیدھا نہیں ہوتا ——— ادب کا وہ جانے کب سے خون کر رہا
ہے، لیکن صحافت میں اُس کا وہی رتبہ ہے جو بمبے سنٹی نل کے ایڈیٹر آنجہانی بی۔ جی
ہارنی مین کا تھا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اُس سے بالشت بھر اونچا ہے۔

ہارنی مین صرف پولیس سے ٹکر لیتا رہا۔ دیوان سنگھ نے اپنی پہلوانی
کے دم خم کئی اکھاڑوں میں دکھائے۔ بڑی بڑی ریاستوں سے پنجہ لڑایا۔
اکالیوں سے متصادم ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور سردار کھڑک سنگھ سے تلوار بازی
کی۔ مسلم لیگ سے چومکھی لڑا۔ پولیس کو تگنی کا ناچ نچایا۔ خواجہ گیسو دراز حضرت
حسن نظامی سے چلتیں کیں۔ تیس سے کچھ اوپر مقدمے چلوائے اور ہر بار سرخرو

رہا۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کمائے اور اڑا ڈالے مفلسی کے زمانے میں اگر کوئی دوست آیا تو چٹکیوں میں چار سو بیس کر کے روپیہ حاصل کیا اور اس کی تواضع پہ خرچ کر دیا۔ جیبیں لبالب بھری ہونے پر مونٹ کی ہیٹ سائنس میں ننگی عورتوں کا رقص دیکھا اور اپنے دوستوں کو دکھایا۔ آپ کم پی اپنے یاروں کو جی بھر کے پلائی۔

دیوان سنگھ مفتون اکائی نہیں۔ دہائی، سینکڑہ، ہزار ہے، دس ہزار ہے بلکہ لاکھ ہے۔ وہ ایک عجائب گھر ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نادر دستاویزات مقفل پڑی ہیں۔ وہ ایک بینک ہے جس کے رجسٹروں میں کروڑوں کا حساب درج ہے۔ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے جس میں لاکھوں جرائم پیشہ انسانوں کے خفیہ حالات موجود ہیں۔

اگر وہ امریکہ میں ہوتا تو وہاں کا سب سے بڑا "گینگسٹر" ہوتا۔ کئی اخبار اُس کے تابع ہوتے۔ بڑے بڑے یہودی سرمایہ دار اُس کے ایک اشارے پر ناچتے۔ وہ رابن ہڈ کا بھی باپ ہوتا۔ مفلسوں کے لئے اُس کی تجوریاں ہر وقت کھلی ہوتیں۔

آپ مفتون کو دیکھئے گا تو اُسے معمولی سا پڑھا لکھا ادھیڑ عمر کا سکھ سمجھیں گے۔ لیکن وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ ایک دن میں نے انھیں ریاست کے خوبصورت پیازی رنگ کے کارڈوں پر دستخط کرتے دیکھا۔ کارڈوں کی

درجن ڈھیریاں لگی تھیں۔ میں نے ایک کارڈ اٹھا کر ٹائپ شدہ عبارت پڑھی —— بیرونی ملک کی کسی فرم سے فہرست بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ سب کارڈ اِسی مضمون کے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اتنی فہرستیں منگا کر سردار صاحب کیا کریں گے۔ میں نے پوچھا "مفتون صاحب، کیا آپ کوئی اسٹور کھولنے والے ہیں"۔

سر کو سکھوں کے مخصوص انداز میں ایک طرف جھٹکا دے کر مفتون خوب ہنسا۔ "نہیں غنو صاحب۔ میں یہ فہرستیں منگا رہا ہوں کہ مجھے اِن کے مطالعے کا شوق ہے"۔

میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ "آپ مطالعہ فرمائیں گے، ایسی فہرستوں کا —— حاصل کیا ہوگا؟"

"معلومات —— میں اپنی معلومات میں اِسی طرح اضافہ کیا کرتا ہوں"۔

"آپ کی ہر بات ہی نرالی ہے"۔

"ڈنلپ کمپنی کیا بناتی ہے؟" ایک دم مجھ سے سوال کیا گیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا۔ "ٹائر"۔

اس پر مجھے بتایا گیا کہ ڈنلپ کمپنی صرف ٹائر ٹیوب ہی نہیں بناتی اور ہزارہا چیزیں بناتی ہے۔ گولف بال۔ ربڑ کے گدے گدیاں۔ ربڑ اسپرنگ۔ نلکیاں۔ ہوز پائپ اور خدا معلوم کیا کیا ——!

جب فہرستیں آتی ہیں تو وہ ہر ایک کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ اسی لئے
میں نے کہا ہے کہ سردار دیوان سنگھ مفتون بہت پڑھا لکھا آدمی ہے وہ
تمام فہرستیں پڑھتا ہے۔ جب بیکار ہو جاتی ہیں تو محلے کے بچوں میں تقسیم کر دیتا
ہے کہ وہ تصویریں دیکھیں اور خوش ہوں ——— بچوں سے اُسے بہت
پیار ہے۔

بیرونی ممالک کے کارخانوں کی فہرستیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے پرچے
کے زوردار اداریئے لکھتا ہے "ناقابلِ فراموش" کا ناقابلِ فراموش کالم لکھتا
ہے۔ سوالوں کے "تیکھے" جواب دیتا ہے اور فصاحت و بلاغت کا ہر جگہ
خون کرتا ہے۔

بہت بدخط ہے۔ جس طرح وہ آپ ٹیڑھا میڑھا ہے، اسی طرح
اُس کے قلم سے نکلے ہوئے حروف ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے
کاتب اُس کا لکھا ہوا کیسے پڑھتا ہے۔ مجھے جب بھی اُس کا خط آیا، میں نے
اندازاً اُس کا مطلب نکالا۔ دوسری مرتبہ غور سے "ڈی سائفر" کرنے
کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میں نے پہلی نظر میں جو مطلب اخذ کیا تھا
بالکل غلط تھا۔ تیسری دفعہ پڑھا تو حروف اپنی صحیح شکل اختیار کرنے لگے
چوتھے مرحلے پر بالآخر عبارت مکمل طور پر روشن ہوئی۔

دیوان سنگھ مفتون بہت محتاط آدمی ہے۔ محاورہ ہے، دودھ کا جلا

چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چھاچھ کے علاوہ وہ پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ کاتب کو ہدایت ہے کہ جب اُس کی لکھی ہوئی سلپیں پیلے کاغذ پر منتقل ہو جائیں تو فوراً واپس کر دی جائیں۔ کتابت شدہ سطور میں اغلاط لگانے کے بعد وہ میز پر پڑی ہوئی کالی صندوقچی کھولے گا اور اُس میں تمام سلپیں ڈال کر اُس کو مقفل کر دیگا اور جب پرچہ چھپ کر آ جائیگا تو اپنی تحریروں کو تلف کر دے گا۔ معلوم نہیں یہ احتیاط کیوں برتی جاتی ہے۔

اُس کی ساری ڈاک ایک تھیلے میں مقفل ہو کر آتی ہے۔ اسے کھول کر وہ ایک ایک خط، ایک ایک اخبار باہر نکالے گا اور ترتیب وار میز پر رکھتا جائے گا۔ لفافہ کھول کر خط نکالنے کے بعد وہ لفافہ ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکتا بلکہ خط کے ساتھ پن لگا کر نتھی کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ رسالوں اور اخباروں کے "ریپر" بھی ضائع نہیں کرتا۔ میں نے اس طریقِ عمل کے متعلق پوچھا تو جواب ملا یہ احتیاط ہر حالت میں اچھی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے، میں کسی اخبار یا رسالے کے خلاف مقدمہ کرنا چاہوں۔ اب قانون یہ ہے کہ اگر لاہور کے کسی اخبار نے میرے خلاف لکھا ہے اور ریپر جس پر میرا نام اور پتہ موجود ہے میں پیش نہیں کر سکتا تو مقدمہ صرف لاہور ہی میں چل سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ "ریپر" اس بات کا ثبوت ہو گا کہ میری بے عزتی

یہاں دہلی میں ہوئی ہے جہاں مجھے یہ پرچہ ارسال کیا گیا ہے، اس لئے میں
یہاں دہلی کی عدالت میں دعوےٰ دائر کر سکتا ہوں"۔

دیوان سنگھ مفتون پر جو آخری مقدمہ (غالباً بیسواں) چلا بہت خطرناک
تھا۔ وہ اور ایک بنگالی بلاک میکر جعلی نوٹ بنانے کے الزام میں ماخوذ تھے۔
میں اُن دنوں بمبئی میں تھا۔ ایک دن مجھے "مصوّر، دہلی" کی معرفت ایک ٹائپ
کیا ہوا خط ملا جس پر کوئی دستخط نہیں تھے۔ ٹائپ میں دیوان سنگھ مفتون لکھا
تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں گواہ کے طور پر پیش ہوں۔

عرصہ ہوا، میں دہلی گیا تھا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں
دفتر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ
لینے لگا۔ بہت بڑا میز تھا جس کے دونوں طرف ریڈیو پڑے تھے۔ قلمدان
کے پاس کروشن سالٹ کی دو بوتلیں تھیں۔ ایک کونے میں پردے کے پیچھے
صوفہ نما چیز تھی جس پر غالباً دیوان صاحب استراحت فرماتے ہوں گے۔
سب الماریاں کھلی تھیں۔

میں نے یہ اور دوسری تفصیلات "مصوّر" میں ایک مضمون کی صورت
میں شائع کی تھیں اور کہا تھا کہ اگر اس کمرے میں چھوٹا سا کمپارٹمنٹ بنا
دیا جاتا جس میں کموڈ ہوتا تو یہ کمرہ کسی ریل کا بہت بڑا ڈبہ دکھائی
دیتا۔

دیوان صاحب نے یہ مضمون سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ جب پولیس نے چھاپہ مارا کر اس کمرے کی الماری سے ایک کتاب میں رکھے ہوئے سو سو کے چھ (غالباً) نوٹ نکالے اور سردار صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی تو انھوں نے مجھے صفائی کے گواہوں میں رکھ لیا۔ اس مضمون سے اور میری گواہی سے یہ ثابت کرنا مطلوب تھا کہ ان کے دفتر میں کوئی بھی شخص بے روک ٹوک آ جا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے میں دہلی میں دیوان صاحب سے اپنی اس ملاقات کے بارے میں بھی کچھ لکھ دوں کہ یہ خاصی دلچسپ تھی۔

دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب وہ نہ آئے تو میں چلا گیا۔ شام کو آیا تو وہ دفتر میں موجود تھے۔ ہیملن ٹائر کا اشتہار کرسی میں بیٹھا تھا۔ سر پر چھوٹی سی سفید پگڑی۔ قلم انگلیوں میں دبائے کچھ لکھ رہے تھے۔ چشمے کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں ایک عجیب انداز میں اوپر کر کے مجھے دیکھا اور یوں اچھلے جیسے ربڑ کی ٹھوس گیند اچھلتی ہے۔ مجھ سے یہ گھٹ گھٹ جھپیاں پائیں" یعنی بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے تھے۔ میں ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔"

مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میرے حالات پوچھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے متوجہ تو ضرور ہیں لیکن ان کا دماغ کچھ اور

سوچ رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ملا کر دوسرے سرے والے سے کہا۔ میں سُندر لال بول رہا ہوں —— نئی دلی سے۔ لالہ ...... ہیں؟ —— کہاں گئے ہیں؟ —— اچھا!

آپ کا دفتر پُرانی دلی میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سندر لال نہیں بول رہا تھا۔ دیوان سنگھ مفتون بول رہا تھا۔ دورانِ گفتگو میں آپ نے کئی مرتبہ اسی طرح مختلف نمبر ملائے اور جعلی ناموں سے لالہ —— کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں —— معلوم نہیں کیا چار سو بیس تھی۔ لیکن مجھے اتنا یقین تھا کہ اُس لالے کی شامت آگئی ہے یا عنقریب آنے والی ہے۔

ٹیلی فون کے ذریعے سے جب کچھ پتہ چلایا نہ چلا تو اُنھوں نے سولھویں مرتبہ مجھے بیئر کی دعوت دینے کے بعد اپنے خاص آدمی (غالباً سردار دیام سنگھ) کو آواز دے کر بلایا۔ اُس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا اور رخصت کر دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "ہاں منٹو صاحب، تو بیئر منگواؤں آپ کے لئے؟"

میں نے جھنجھلا کر کہا "سردار صاحب زبانی جمع خرچ آپ نے آخر سیکھ ہی لیا دلی والوں سے —— منگوائیے۔ منگواتے کیوں نہیں؟"

یہ سن کر دیوان صاحب خوب کھل کر ہنسے اور اہالیانِ یو۔پی کو بے نقط سُنانے لگے۔ انسانوں کی اس قسم سے اُن کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ چنانچہ جب

بھی انھیں اپنے دفتر میں کسی ملازم کی ضرورت ہوتی ہے تو اشتہار میں یہ بات
خاص طور پر لکھی ہوتی ہے کہ صرف پنجابی درخواست بھیجیں ــــ لیکن
عجیب بات ہے کہ آپ احسان بھیا کو اپنا بہترین دوست یقین کرتے ہیں۔
اُن کے دل میں یو پی کے اس باشندے کا بہت احترام ہے۔

ایک مرتبہ دیوان صاحب کو اپنی موٹر ایک تنگ بازار سے گزارنا تھی
میں اُن کے ساتھ تھا۔ موٹر مڑی تو سڑک کے عین بیچ کئی چارپائیاں بچھی
دکھائی دیں۔ آپ آگ بگولا ہو گئے۔ لگے دلی والوں اور اُن کی ہشت پشت
کو بے نقط سنانے "کم بختو ــــ تمہارے اسلاف۔ تمہارے آباؤ اجداد
نے بھی اسی طرح چارپائیوں پہ دن رات سو سو کر اپنی سلطنت کا بیڑہ
غرق کیا تھا ــــ اب تمہارے پاس کیا رہ گیا ہے جس کا بیڑہ غرق کرو گے۔
خدا تمہارا بیڑہ غرق کرے۔"

ایک لڑکے نے چارپائی اُٹھانے کی کوشش کی مگر اُس سے نہ اُٹھی۔
دیوان صاحب موٹر سے باہر نکلے اور چارپائی کو اُٹھا کر پھینک دیا۔ "برخوردار
تم سے نہ اُٹھتی ــــ اری کمریا دیکھو ــــ تمہارے والد بزرگوار یقیناً تم سے
بھی کہیں زیادہ نازک ہوں گے۔ اُن سے تو پیخانے جاتے وقت لوٹا بھی نہ
اُٹھایا جاتا ہوگا۔"

اس پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے کرخنداروں کی زبان

میں ہوا ہی تباہی بکنا شروع کیا مگر دیوان صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ موٹر میں آرام سے بیٹھے اور چلانا شروع کر دی۔

سردار صاحب کو پنجابی بہت پسند ہیں، شاید اس لئے کہ وہ ایک زمانے سے دہلی میں قیام پذیر ہیں، ورنہ بہ حقیقت اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں کہ صرف پنجابی ہونا اچھے انسان کی دلیل نہیں۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اپنے دفتر کی ملازمت کے سلسلے میں پنجابی کی قید لگا کر اُنھوں نے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جتنا نقصان اُن کو پنجابیوں نے پہنچایا ہے اُس کا عشر عشیر بھی یو۔پی کے رہنے والوں نے نہیں پہنچایا۔

اب میں اُن کے آخری اور خطرناک مقدمے کی طرف لوٹتا ہوں۔ میں دہلی گیا۔ سردار صاحب ضمانت پر رہا تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کو تنگ کرنے کے لئے اُن کے مقدمے کی سماعت دہلی سے بہت دور گوڑگانواں کی ایک عدالت میں ہو رہی ہے۔ ہم وہاں موٹر میں گئے۔ وکیل نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ میری گواہی دس منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔

سردار صاحب کو اپنا تحریری بیان پیش کرنا تھا۔ جب حوالات میں تھے تو آپ نے اس کے نوٹ لے لئے تھے۔ اب یہ چھوٹے ٹائپ میں غالباً چالیس پچاس صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اِسے جستہ جستہ دیکھا

اور میرا ذہن فرانس کے مشہور مصنّف ایمیل زولا کے شہرۂ آفاق مضمون I ACUSE کی طرف منتقل ہو گیا۔

دیوان سنگھ مفتون کا یہ بیان ملزم کا صفائی کا بیان نہیں تھا، بلکہ فردِ جرم تھی حکومت اور اُس کے کارندوں کے خلاف۔ آخر میں انھوں نے اپنے مقدمات کی فہرست لگا رکھی تھی۔ ہر صفحے پر مختلف خانے بنا کر یہ واضح کیا گیا تھا کہ کون سا مقدمہ کب چلا، کس کی ایما پر چلا، کس کی عدالت میں پیش ہوا اور اُس کا کیا فیصلہ ہوا۔

غالباً بتیس مقدمے تھے۔ ان میں سے اکتیس میں وہ باعزت طور پر بری ہوئے تھے۔ صرف ایک مقدمہ تھا ـــ بہت بڑا اور بہت مشہور مقدمہ (جو نواب بھوپال نے اُن پر چلا یا تھا) جس میں اُن کو شاید صرف اُس عرصے کی سزا سے قید دی گئی تھی جو انھوں نے حوالات میں گذارہ تھا۔

سردار صاحب نے فاضل جج کے یہ الفاظ خاص طور پر اپنے بیان میں درج کئے ہوئے تھے: "میں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر 'ریاست' دہلی کی ہمت کی داد دیتا ہوں جو اپنے محدود ذرائع کے باوجود طویل عرصے تک ایک شہزادے کا تندہی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔"

نواب بھوپال سے سردار دیوان سنگھ مفتون واقعی بہت دلیری اور ثابت قدمی سے لڑا، لیکن اس جنگ میں اُس کا دیوالہ پٹ گیا۔ جو جمع پونجی

تھی سب پانی کی طرح بہہ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اُس کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کمر ٹوٹ جاتی، مگر مفتوںؔ نے حوصلہ نہ ہارا اور جوں توں اپنا پیارا پرچہ ''ریاست'' شائع کرتا رہا۔

اُس نے بڑے بڑے آدمیوں سے مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی لیکن اپنی زندگی میں ایک آدمی سے شکست بھی کھائی۔ کس سے؟ —— خواجہ حسن نظامی سے۔

سردار صاحب نے ایک دن زچ نچ ہو کر مجھ سے کہا ''میں نے بڑی بڑی قطب صاحب کی لاٹھوں کو جھکا دیا۔ مگر یہ کم بخت حسن نظامی مجھ سے نہیں جھکایا جاسکا۔ منٹو صاحب۔ میں نے اس شخص کے خلاف اتنا لکھا ہے اتنا لکھا ہے کہ اگر ریاست کے وہ تمام پرچے جن میں یہ مضامین چھپتے رہے ہیں اُس پر رکھ دیئے جائیں تو اُن کے وزن ہی سے اُس کا کچومر نکل جائے —— لیکن اُلٹا میرا کچومر نکل گیا ہے —— میں نے اُس کے خلاف اس قدر زیادہ اس لئے لکھا کہ میں چاہتا تھا وہ مجبوراً قانون کو پکارے —— کھلی عدالت میں مقدمہ پیش ہو اور میں وہاں اُس کا ڈھول کا پول کھول کے رکھ دوں —— مگر وہ بڑا کائیاں ہے۔ اُس نے مجھے کبھی ایسا موقع نہیں دیا اور نہ دے گا۔''

یہ عجیب بات ہے کہ کسی زمانے میں سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ اور

خواجہ حسن نظامی ہیں گاڑھی چھنتی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔

میں پھر مقدمے کی طرف آتا ہوں۔ گوجرانوالہ کی عدالت نے اُن کو غالباً دو دفعات کے ماتحت بارہ بارہ برس قید بامشقت کی دو سزائیں دیں۔ سردار صاحب نے گوجرانوالہ ہی میں مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہاں کا مجسٹریٹ مجھے کڑی سے کڑی سزا دے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن انھوں نے مجھے تسلی دی تھی کہ متفکر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہائی کورٹ میں صاف بری ہو جاؤں گا۔ یہ بھی صحیح ثابت ہوا۔

ہائی کورٹ نے انہیں باعزت طور پر بری کر دیا۔

سردار صاحب نے مجھ سے گوجرانوالہ میں کہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے شملے میں تھے۔ وہاں ایک پارٹی تھی جس میں سر ڈگلس ینگ (اس زمانے کے چیف جسٹس) بھی تھے۔ وہ اس کے خلاف بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ سردار صاحب کو حیرت ہوئی جب سر ڈگلس نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہر حال اُن دونوں کی ملاقات ہوئی اور چیف جسٹس نے اُن کے قلم کی توانائی کی بہت تعریف کی اور کہا "میں ایسے آدمیوں کا دوست ہوں۔ اگر میں کبھی تمھارے کام آسکا تو یقین مانناکہ میں تمھاری ضرور مدد کروں گا۔"

جہاں تک میں سمجھتا ہوں سر ڈگلس ینگ کے اس وعدے کو سردار دیوان سنگھ

کی بریت کافی دخل ہونا چاہیے۔

مقدمہ دیر تک چلتا رہا۔ دیوان صاحب جیل میں تھے۔ اس مقدمے کی روداد بڑی دلچسپ تھی۔ استغاثے کی طرف سے یہ کہانی پیش کی گئی تھی کہ دیوان سنگھ نے کچھ جعلی نوٹ، چلانے کی خاطر اپنے دوست جیون لال متّو کو ایک لفافے میں لاہور بھیجے تھے جو راستے ہی میں پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لفافے میں ایک ٹائپ کیا ہوا خط بھی تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیئے کہ یہ خط دیوان صاحب نے اپنے دفتر کے ٹائپ رائٹر پر تیار کیا تھا، عدالت میں آسے بھی پیش کیا گیا۔

خط میں حرف "او" اور "بی" کے بیٹ کثرتِ استعمال سے بھر گئے تھے۔

ہائی کورٹ میں جب پیش کردہ ٹائپ رائٹر کی تحریر کا نمونہ لیا گیا تو "او" اور "بی" کے پیٹ بالکل صاف تھے۔ اس کے علاوہ جب صفائی کی طرف سے یہ استفسار کیا گیا کہ لفافہ جو کہ بقول استغاثہ دیوان سنگھ مفتون نے جیون لال متو کو بھیجا، اُس پر دہلی کے ڈاکخانے کی مہر گیارہ جنوری کی تاریخ بتاتی ہے اور لاہور کے ڈاکخانے کی مہر ظاہر کرتی ہے یہ لفافہ بندرہ جنوری کو ڈی لور ہوا۔ گیارہ تاریخ کا چلا ہوا لفافہ مکتوب الیہ کو زیادہ سے زیادہ تیرہ تاریخ کی صبح کو مل جانا چاہیے تھا۔ تاریخیں غلط

ہیں۔ اصل تاریخیں مجھے یاد نہیں رہیں)۔ تین دن یہ لفافہ کہاں بھٹکتا رہا۔
یہ سوال اٹھنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ استغاثہ اس کا کوئی
معقول جواب نہ دے سکا اور آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ یہ نکتہ ملزم کو،
شک کا فائدہ بخشنے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ دہلی میں (اُن دنوں میں
آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا) اخباروں میں یہ خبر دیکھی کہ سردار دیوان سنگھ
مفتون ایڈیٹر ریاست، دہلی جعلی نوٹ بنانے کے مقدمے میں صاف
بری کر دیئے گئے ہیں۔

دوسرے دن صبح آٹھ نو بجے کے قریب حسن بلڈنگز نکلسن روڈ کے
فلیٹ نمبر نو (جس یہاں رہتا تھا) کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی
نے دروازہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ دیوان صاحب ہیں۔ میں نے دوڑ کر اُن کا
استقبال کیا۔ اُنھوں نے مجھے بازوؤں میں لے لیا اور "گھٹ گھٹ
جھپیاں پائیں"۔

پیشتر اس کے کہ میں انھیں مبارکباد دیتا، اُنھوں نے مجھ سے کہا۔
"سبحان اللہ —— لطف آگیا"۔

میں نے اُن سے پوچھا۔ "کس بات کا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے جیل میں آپ کی کتاب 'منٹو کے افسانے'
پڑھی۔ اس کا انتساب خوب تھا —— اخبار دین دنیا کے نام جس میں میرے

خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں ——— میں آج صبح دہلی آیا ہوں۔ میں نے سوچا سب سے پہلے چل کر منٹو صاحب کو داد دینی چاہیے۔"

اِس سے مجھ پر ثابت ہوا کہ شئے لطیف اُن میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ٹائپ رائٹر میں "اد" اور "بی" کی کیز کیسے تبدیل ہوئیں بلکہ اتنی دیر کے بعد کیوں "ڈی لور" ہوا۔ یہ ایک راز ہے جو سدا راز رہے گا۔ جب میں نے اُن سے اس بارے میں پوچھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے "منٹو صاحب، یہ ہاتھ کی صفائی ہے۔"

ہاتھ کی صفائی ہو یا پاؤں کی۔ استغاثے کی طبیعت یقیناً صاف ہو گئی تھی۔

دیوان صاحب کو مجھ سے پیار ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کا وہ احترام کرتے ہیں۔ ہم دونوں دہلی میں تھے۔ اُن کو جب بھی فرصت ہوتی ہمیں ڈھونڈ نکالتے اور کسی دُور دراز خاموش مقام پر لے جاتے۔ وہاں ہم سب بیٹھ کے پیتے، گپیں لڑاتے پھر وہ ہم دونوں کو گھر چھوڑ جاتے۔ ایسی نشستوں میں کوئی سیاسی یا ادبی بات نہیں ہوتی تھی۔

ایک لطیفہ سنئے جو انھوں نے خود مجھے سنایا۔ انتہائی مفلسی کے دن تھے کہ اُن کا ایک دوست آن وارد ہوا۔ پہلے تو وہ بہت سٹپٹائے کہ جیب

میں ایک ادھیلا بھی نہیں تھا، لیکن فوراً اُن کو ایک ترکیب سُوجھی۔ بارہ
قیمت کی بوتلیں منگوائیں۔ دو دوست کو پلائیں، دو خود پییں۔ باقی آٹھ غسلخانے
میں خالی کر دیں اور نوکر سے کہا جاؤ یہ بارہ خالی بوتلیں بیچ آؤ۔ جنگ کا زمانہ
تھا۔ گری والی بوتلیں اچھے دام لے آئیں، چنانچہ دوست کو رات کا کھانا
کھلانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دوسرے تیسرے روز انھوں نے دکاندار کو بارہ
بوتلوں کی قیمت ادا کر دی۔

ایک زمانہ آیا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے جانی دشمن ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا
ہر پروگرام سُنتے۔ ایک رجسٹر تھا جس میں کئی خانے بنے تھے۔ اس میں درج تھا کہ
ریڈیو کے کس افسر کا کس گانے والی سے ٹانکا (یہ لفظ اُن کی خاص الخاص
ایجاد ہے) ہے۔

اگر کوئی گانے والی کسی وجہ سے پروگرام میں شریک نہ ہو سکتی اور اس
کی جگہ کسی اور کو گوایا جاتا تو اُن کو فوراً معلوم ہو جاتا، کس افسر کی مہربانی
ہوئی ہے۔

بہت دیر تک وہ ذوالفقار بخاری کے خلاف لکھتے رہے۔ آخر
جُگل کشور (حال احمد سلمان ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) پر پل پڑے
جگل کشور پہلے کلکتے میں تھے۔ دہلی تبدیل ہو کر آئے تو اُن کو وہاں کی ایک
بنگالن نے محبت نامے بھیجنے شروع کئے۔ جگل کو حیرت تھی کہ یہ خط میرے پاس

نہیں پہنچتے ، مفتوں کو ملتے ہیں - یہ بھی غالباً ہاتھ کی صفائی تھی۔ بہرحال میں نے منت خوشامد کر کے جگل صاحب کی گلوخلاصی کرائی اور اُن سے درخواست کی کہ بنگالن کے خطوط دے دیجئے ۔ آپ نے مسکرا کر کہا " میں اتنا بیوقوف نہیں ۔ اگر آپ کا دوست یہ خط پڑھنا چاہتا ہے تو میں نقل کرا کے اُس کو بھجوا دوں گا "

میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا ۔

دہلی میں ایک شخص جو امرتسر کا بعتی میلا اہم شہر تھا سخت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا - اُس کا چھوٹا بھائی ایک لڑکی کو بھگا کر دہلی لے آیا تھا اُس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے ۔ وہ اس معاملے کو سلجھانے کے لئے میری مدد چاہتا تھا ۔ میں اُسے دیوان صاحب کے پاس لے گیا ، انھوں نے سارا ماجرا سن کر حکم دیا ۔ اغوا کرنے والے اور مغویہ کو میرے پاس لاؤ ۔

دوسرے دن دیوان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے کہا " وہ لوگ آ گئے تھے ۔۔۔ میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے " سب ٹھیک کر ہی دیا ہو گا ورنہ وہ شخص میرے پاس دوبارہ ضرور آتا ۔

دیوان سنگھ کی معلومات کے ذریعے بہت وسیع ہیں ۔ پاکستان میں کسی کے فرشتے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ قائد اعظم زیارت میں خطرناک طور پر علیل ہیں ، لیکن " ریاست " میں اس مضمون کا ایک نوٹ ، گو بہت ہی دل آزار

دو ہفتے پہلے شائع ہو چکا تھا جس میں دیوان صاحب نے اپنے مخصوص ظالمانہ انداز میں لکھا تھا کہ قائد اعظم محمد علی جناح بستر مرگ پر ہیں، لیکن میری دعا ہے کہ زندہ رہیں اور پاکستان کو . . . .

اب ریاستیں نہیں رہیں۔ راجے ہیں نہ مہاراجے جو اس کے دل پسند کھلونے تھے، مگر سردار دیوان سنگھ مفتون نے یقیناً اور کھلونے چن لئے ہوں گے۔ راجہ نہیں ہو گا کوئی وزیر ہو گا۔ مہارانی نہیں ہو گی تو کسی بہت بڑے سرمایہ دار کی کھل کھیلنے والی دھرم پتنی ہو گی۔ مفتون کا جنون کیسے فارغ بیٹھ سکتا ہے۔

لوگ اسے بلیک میلر، دغا باز، چور، اچکا کہتے ہیں، مگر وہ اپنے پہلو میں انسانیت دوست دل رکھتا ہے۔ پچھلے فسادات میں اس نے جتنے مسلمانوں کو خونخوار سکھوں اور ہندوؤں سے بچایا، جتنی مسلمان عورتوں اور ان کے بچوں کو پناہ دی۔ ان کے دل سے اس کے لئے جو دعائیں نکلی ہوں گی، میرا خیال ہے کہ وہ اس کی مغفرت کے لئے کافی ہیں۔

پچھلے دنوں میں سخت بیمار تھا میو ہسپتال کے اے وارڈ میں مجھ پہ نیم بے ہوشی اور بے ہوشی دس پندرہ روز تک طاری رہی۔ میری بیوی اور بہن نے مجھے بتایا کہ اس عالم میں بار بار میں سردار دیوان سنگھ مفتون کو یاد کرتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دلی میں ہوں "ریاست" کا دفتر کچھ دور ہے مگر وہاں ٹیلی فون کیا جا سکتا ہے۔ میں ان سے کہتا، جاؤ ٹیلی فون کرو اور

دیوان صاحب سے کہو کہ منٹو بلا رہا ہے آپ کو۔ بہت ضروری کام ہے۔

وہ سمجھاتے تھے کہ تم لاہور میں ہو، لیکن میں بضد تھا کہ نہیں میں دلی میں ہوں۔ تم جاؤ اور دیوان صاحب کو ٹیلی فون کرو۔ وہ فوراً آجائیں گے۔

گو اُن دنوں عالمِ برزخ میں تھا۔ ہونے نہ ہونے کے درمیان معلق تھا۔ میرا دماغ دھند میں لپٹا ہوا تھا، مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جہاں میرا بستر تھا، اس سے کچھ دُور فاصلے پر ایک دروازہ تھا۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا ہال جس میں دو یورپی بچے پنگ پانگ کھیلنے آتے تھے۔ اس کو طے کر جائیے تو باہر پلازا سینما (دہلی) کا گیٹ آ جاتا۔ مگر افسوس کہ یہ ہر وقت بند رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں بار بار لوگوں سے درخواست کرتا کہ وہ ٹیلی فون کر کے سردار دیوان سنگھ مفتون کو بلائیں۔ مجھے کونسا ضروری کام تھا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرے قریب قریب ماؤف دماغ میں صرف دیوان صاحب کی یاد کیسے باقی رہی۔

نواب کاشمیری

یوں تو کہنے کو ایک ایکٹر تھا۔ جس کی عزت اکثر لوگوں کی نظر میں کچھ نہیں ہوتی جس طرح مجھے بھی محض افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ایک فضول سا آدمی۔ پر یہ فضول سا آدمی اس فضول سے آدمی کا جتنا احترام کرتا تھا وہ کوئی بے وضول شخصیت، کسی بے وضول شخصیت کا اتنا احترام نہیں کر سکتی۔

وہ اپنے فن کا بادشاہ تھا۔ اس فن کے متعلق آپ کو یہاں کا کوئی وزیر کچھ بتا نہ سکے گا مگر کسی پھٹے پرانے ہوئے مزدور سے پوچھیں جس نے چونی دے کر نواب کاشمیری کو کسی فلم میں دیکھا ہے۔ تو وہ اس کے گن گانے لگے گا وہ آپ کو بتائے گا (اپنی خام زبان میں) کہ اس نے کیا کمال دکھائے۔

انگلستان کی یہ رسم ہے کہ جب ان کا کوئی بادشاہ مرتا ہے تو فوراً اعلان کیا جاتا ہے " بادشاہ مر گیا ہے — بادشاہ مر گیا ہے — بادشاہ کی عمر دراز ہو"

نواب کاشمیری مر گیا ہے — لیکن میں کس نواب کاشمیری کی درازیٔ عمر کے لئے دعا مانگوں — مجھے تو اس کے مقابلے میں تمام کردار پیا یچھے معلوم ہوتے ہیں۔

نواب کاشمیری سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ خان کاشمیری جو ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ساتھ تھے۔ بمبئی کے ایک اسٹوڈیو میں ہم دیر تک بیٹھے اور باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے اس کو اپنی ایک فلمی کہانی سنائی۔ لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے بلا تکلف کہہ دیا۔

" ٹھیک ہے — لیکن مجھے پسند نہیں "

میں اس کی اس بے باک تنقید سے بہت متاثر ہوا۔ دوسرے روز میں نے اسے پھر ایک کہانی سنائی۔ سننے کے دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے جب میں نے کہانی ختم کی تو اس نے رومال سے آنسو خشک کر کے مجھ سے کہا " یہ کہانی آپ کس فلم کمپنی کو دے رہے ہیں — بھڑوے کا رول مجھے بہت پسند ہے "

میں نے اس سے کہا " یہ کہانی کوئی پروڈیوسر لینے کے لئے تیار نہیں "

نواب نے کہا: "تو لعنت بھیجو اُن پر ——"

نواب مرحوم کو پہلی بار میں نے "یہودی کی لڑکی" میں دیکھا تھا۔ جس میں رتن بائی ہیروئن تھی نواب عذرا یہودی کا پارٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے یہودیوں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ لیکن جب بمبئی گیا۔ تو یہودیوں کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ نواب نے ان کا صحیح۔ سو فیصد صحیح پورا اُتارا ہے۔ جب نواب مرحوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ عذرا یہودی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے اس نے کلکتہ میں یہ پارٹ ادا کرنے سے پہلے کئی یہودیوں کے ساتھ ملاقات کی۔ ان کے ساتھ گفتگو میں جاتا رہا اور جب اس نے محسوس کیا۔ وہ یہ رول ادا کرنے کے قابل ہو گیا ہے تو اس نے مسٹر بی۔ این سرکار مالک نیو تھیٹرز سے حامی بھر لی۔

جن اصحاب نے "یہودی کی لڑکی" فلم دیکھا۔ ان کو نواب کا شمیر کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس نے بوڑھا بننے کے لئے اور پوپلے منہ باتیں کرنے کے لئے اپنے سارے دانت نکلوا دیئے تھے تاکہ کردار نگاری پہ کوئی حرف نہ آئے۔

نواب بہت بڑا کردار نگار تھا۔ وہ کسی ایسے فلم میں حصہ لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ جس میں کوئی ایسا رول نہ ہو۔ جس میں وہ سما سکتا ہو۔ چنانچہ وہ کسی فلم کمپنی سے معاہدہ کرنے سے پہلے پوری کہانی سنتا تھا۔ اس کے بعد کمر

جاتا کہ اس پر کئی دن غور کرتا تھا ـــــ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر مختلف جذبات پیدا کرتا تھا ـــ جب اپنی طرف سے مطمئن ہو جاتا تو معاہدہ پر دستخط کر دیتا۔

اس کو آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں سے بہت محبت تھی، مگر تعجب ہے کہ یہ شخص جو عرصے تک امپیریل تھیٹریکل کمپنی کے ڈراموں میں اسٹیج پر آتا رہا اور داد تحسین وصول کرتا رہا۔ فلم میں آتے ہی ایک دم بدل گیا ـــ اس کے لب و لہجے میں کوئی تھیٹریت نہیں تھا۔ وہ اپنے مکالمے اسی طرح ادا کرتا تھا۔ جس طرح کہ لوگ عام گفتگو کرتے ہیں۔

جس تھیٹریکل کمپنی کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس میں نواب مرحوم نے "خوبصورت بلا" "نورِ وطن" اور "بازغ ایران" میں اپنی اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

نواب کاشمیری لکھنؤ کے بڑے امام باڑے کے سید مفتیٔ اعظم کے اکلوتے لڑکے تھے۔ قدرت کی یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہاں امام باڑے کا مفتیٔ اعظم اور کہاں منڈوہ۔ لیکن بچپن ہی سے اس کو ناٹک سے لگاؤ تھا۔

لکھنؤ میں ایک ناٹک کمپنی آئی۔ جس کا مالک اگروال تھا اس کمپنی کے کھیل نواب باقاعدہ دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سلسلے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، کھیل دیکھ کر گھر آتا تو گھنٹوں اس ڈرامے کے یاد رہے ہوئے

مکالمے اپنے انداز میں بولتا۔

اس ناٹک کمپنی میں چنانچہ ایک مرتبہ خود کو پیش کیا کہ وہ اس کا امتحان لیں۔ ڈائرکٹر نے جب نواب کی ایکٹنگ دیکھی اور مکالمے کی ادائیگی سنی تو حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے فوراً اسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اس کی تنخواہ کیا مقرر ہوئی۔

اس کمپنی کے ساتھ نواب کلکتہ پہنچے۔ اور اپنے مزید جوہر دکھائے۔ کاؤس جی کھٹاؤ جی نے ان کی اداکاری دیکھی تو ان کو الفریڈ تھیٹر کمپنی میں لے لیا۔ ان دنوں وہ کیریکٹر ایکٹر مشہور ہو گئے۔

سیٹھ سکھ لال کرنانی جو الفریڈ تھیٹر کے مالک تھے۔ اور پرلے درجے کے گدھے اور بے وقوف تھے۔ انھوں نے اپنے حواریوں سے سُنا کہ ایک ایکٹر جس کا نام نواب ہے، کمال کر رہا ہے۔ اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ تو انھوں نے اپنے ٹھیٹ اندازِ گفتگو میں کہا "تو لے آؤ اس سانڈ کو۔" وہ سانڈ آ گیا ـــــ اور وہ سانڈ نواب کاشمیری تھا۔ اس کو زیادہ تنخواہ دے کر اپنے یہاں ملازم رکھا۔ وہ دیر تک میرا مطلب ہے دو سال تک کرنانی صاحب کی کمپنی کے کھیلوں میں کام کرتے رہے۔

مجھے یاد نہیں کون سا سن تھا ـــــ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب بمبئی کی "امپیریل فلم کمپنی" نے ہندوستان کا پہلا بولتا فلم "عالم آرا" بنایا تھا۔

جب بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو مسٹر بی۔ این سرکار جو بڑے تعلیم یافتہ اور سوجھ بوجھ کے مالک تھے انھوں نے جب نیو تھیٹرز کی بنیاد رکھی تو نواب کاشمیری کو جس سے وہ اکثر ملتے جلتے تھے۔ اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ تھیٹر چھوڑ کر فلمی دنیا میں آجائے۔

بی۔ این سرکار نواب کو اپنا علامہ زم نہیں محبوب سمجھتے تھے۔ ان کا ذوق بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ وہ آرٹ کے گرویدہ تھے۔ نواب مرحوم کا پہلا فلم "یہودی کی لڑکی" تھا۔ اس فلم کی ہیروئن "رتن بائی" تھی جس کے سر کے بال اس کے ٹخنوں تک پہنچتے تھے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر ایک بنگالی مسٹر اٹھارتھی تھے۔ (جو اب دنیا تیاگ چکے ہیں) اس ٹیم میں حافظ جی اور میوزک ڈائرکٹر بالی بھتے۔ اس تگڑے ہم میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے اس مضمون میں جائز نہیں۔

مسٹر اٹھارتھی نے جو بہت پڑھے لکھے اور قابل آدمی تھے مجھ سے کہا کہ نواب ایسا ایکٹر پھر کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے رول میں ایسے دھنس جاتا ہے جیسے ہاتھ میں دستانہ۔ وہ اپنے فن کا ماسٹر ہے۔

حافظ جی بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا اچھا ایکٹر کبھی نہیں دیکھا۔

خیر ان باتوں کو چھوڑیئے ــــ میں اب نواب ایکٹر کی طرف

اٹھاتا ہوں۔

ایک فلم میں جس کا عنوان غالباً "مایا" تھا۔ مرحوم کو جیب کترے کا پارٹ دیا گیا۔ اس نے جب ساری کہانی سنی تو انکار کر دیا کہ میں یہ رول ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میں جیب کترا نہیں ہوں — میں نے آج تک کسی کی جیب نہیں کاٹی — لیکن وہ گلگشت کے ایک واہیات ہوٹل میں ہر روز جاتا رہا۔ وہاں اس کی کئی جیب کتروں اور اٹھائی گیروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں — مشہور ہے کہ ان کے ساتھ اس نے شراب بھی پی — حالانکہ اسے اس کی عادت نہیں تھی — ایک ہفتے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا چنانچہ اس نے فلم کمپنی کے مالک سے کہہ دیا کہ وہ جیب کترے کا رول ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔

اس نے اس دوران میں کئی بدمعاشوں اور بدکرداروں سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ ان کے تمام خصائص اس نے سیکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس رول میں کامیاب رہا۔ مرحوم کی زندگی یوں بڑی پاک صاف تھی، ان کے ایک عزیز ہیں۔ ایم عماد ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ نواب بڑا طہارت پسند تھا۔ شیعہ تھا۔ کوئی کام بغیر استخارے کے نہیں کرتا تھا۔ سنی اور شیعہ ہونے میں کیا فرق ہے۔ لیکن جب ان دو فرقوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے دماغوں میں مذہبی فتور ہے۔

میں نواب مرحوم کی بات کر رہا تھا ——— میں وہ جھگتی کا سین "کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب اس نے اپنی بدچلن بیوی کو بھنے ہوئے چنے دیئے ——— اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اتنا غم و اندوہ تھا جو چہرہ بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔

"دلیپ داس" میں جب بے سگل اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے، تو وہ کچھ دیر اپنا چہرہ سہلاتا ہے جہاں ضرب آئی ہے۔ اور صرف اتنا کہتا ہے۔ "تم نے دینو بھائی کو مارا" ——— اور ——— اب میں کیا کہوں ——— سارے حساس تماشائی لرز جاتے ہیں۔

فلم "غندی" میں جب اس کے بھتیجے کی بیوی (کلدیپ کور) اس کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہ غصّے کے عالم میں (پران ایکٹر سے) جا رہی ہوتی ہے ——— نواب کاشمیری مرحوم "نواب ڈچیئر" میں بیٹھا ہے ——— اس کو دیکھتا ہے ——— اور عجیب فلسفیانہ انداز میں ہم کلامی کرتا ہے "پھر ——— چلی گئی"

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن آپ کو فی الحال یہ بتا دینا چاہتا ہوں جو غالباً ابھی تک کسی پرچے میں شائع نہیں ہوا کہ اس کی پہلی بیوی اپنے وطن کی تھی۔ اس لڑکی سے اس کی کب شادی ہوئی۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔

اس بیوی سے اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جب اس طرف سے ناامیدی ہوئی تو نواب نے اِدھر اُدھر کسی دوسرے رشتے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ آخر پرنس مرزا قدر (بادشاہ اودھ کے بڑے لڑکے) کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لے لیا۔

جب یہ شادی ہوئی تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ نواب نے کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی پہلی بیوی نے خودکشی کر لی۔ اب آپ اس خودکشی کا مختصر حال سن لیجئے۔ جب اس کی پہلی بیوی کو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی ہے تو اس نے نوکرانی سے تو شک منگوائی۔ اس پر مٹی کا تیل چھڑکا — اس کے بعد اپنے تن بدن پر بھی یہی تیل ملا — اپنے کپڑوں کو بھی اس سے مانوس کیا — پھر آرام سے چارپائی پہ لیٹ کر، دیا سلائی جلائی اور خود کو آگ لگا دی — وہ مر گئی — نواب کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی بیوی کوئلہ بن گئی ہے۔ وہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ دوسرے گھر میں تھا۔

جب نواب کو معلوم ہوا کہ وہ مر گئی ہے تو اس نے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ آخری وقت یہ وصیت کر گئی تھی کہ اپنی دس ہزار کی انشورنس پولیسی میں اپنے خاوند کے نام سپرد کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک سو ساٹھ تولہ سونا بھی میں ان کی تحویل میں دیتی ہوں۔

نواب یہ وصیت سن کر بہت متعجب ہوا۔

اسے دیر تک مٹی کے تیل کی بُو آتی رہی تھی۔

میں اب کبھی سوچتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں مٹی کا تیل ہوں۔ کیروسین ہوں۔ نواب کاشمیری ہوں ــــ کاشمیری میں بھی ہوں لیکن اتنا ظالم نہیں جتنا کہ وہ تھا۔ اس لئے کہ اس نے صرف اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو خودکشی پر مجبور کر دیا ــــ

میں بھی کشمیری ہوں ــــ مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے۔ لیکن میں ایسے کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے بُرا سلوک کریں۔

میں نواب مرحوم کے فن کا قائل ہوں۔ میں اسے بہت بڑا فن کار مانتا ہوں ــــ لیکن جب بھی میں نے اسے اسکرین پر دیکھا تو مجھے گھاسلیٹ (مٹی کے تیل) کی بُو آئی۔

خدا کرے اسے دوزخ نصیب ہو، کہ وہاں وہ زیادہ خوش رہے گا۔

ستارہ

لکھنے کے معاملے میں مَیں نے بڑے بڑے کڑے مراحل طے کئے ہیں لیکن مشہور رقاصہ اور ایکٹرس ستارہ کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے میں مجھے بڑی ہچکچاہٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے آپ تو اسے ایک ایکٹرس کی حیثیت سے جانتے ہیں جو ناچتی بھی ہے اور خوب ناچتی ہے لیکن مجھے اس کے کردار کا مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ ملا ہے جو عجیب و غریب ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں کئی عورتوں کے کردار و اطوار کا مطالعہ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ستارہ کے حالاتِ زندگی مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوئے تو میں چکرا گیا وہ عورت نہیں ایک طوفان ہے اور وہ بھی ایسا

طوفان جو صرف ایک مرتبہ آکے نہیں ٹلتا۔ بار بار آتا ہے۔ ستارہ یوں تو
میانہ قد کی عورت ہے مگر بلا کی مضبوط ہے۔ اس نے جتنی بیماریاں سہی
ہیں میرا خیال ہے اگر کسی اور عورت پہ نازل ہوتیں تو وہ کبھی جانبر نہ ہو سکتی۔
وہ طبعاً بہت حوصلہ مند ہے، شاید اس لئے کہ وہ کسرت کی عادی ہے۔
میں نے دیکھا ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر وہ کم از کم ایک گھنٹے تک
ریاضت کرتی تھی اور یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہوتی تھی ایک
گھنٹہ بھرپور ناچنا ہڈیوں تک کو تھکا دیتا ہے مگر ستارہ مجھے کبھی تھکی تھکی
دکھائی نہیں دی اصل میں اس میں وہ چیز جسے انگریزی میں STAMINA
کہتے ہیں بدرجہ اتم موجود ہے وہ تھکنے والی جنس نہیں دوسرے تھک ہار
جائیں گے مگر وہ ویسی کی ویسی رہے گی جیسے اس نے کوئی مشقت نہیں
کی اس کو اپنے فن سے پیار ہے اسی والہانہ قسم کا جو وہ مختلف مردوں
سے کرتی رہی ہے۔

معمولی سے ڈانس کے لئے وہ اتنی محنت کرے گی جتنی کوئی رقاصہ
عمر بھر نہیں کر سکتی اس کی طبیعت میں اپج ہے وہ ہمیشہ کوئی خاص بات
کرنا چاہے گی۔ چابک پھرت جو ایک نٹنی میں ہو سکتی ہے اس میں ضرورت
سے زیادہ موجود ہے وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی نچلی نہیں بیٹھ سکتی اس کی
بوٹی بوٹی تھرکتی رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ نیپال کی رہنے والی ہے نجمہ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں. لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ستارہ کے علاوہ اس کی دو بہنیں اور تھیں یہ تر شول یوں مکمل ہوتا ہے. تارہ، ستارہ اور الکنندہ۔ تارہ اور الکنندہ تو اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے ان کا نام بھی کسی کو یاد نہیں ہوگا۔

ان تین بہنوں کی زندگی ویسے بہت دلچسپ ہے. تارہ کی کئی مردوں سے وابستگی رہی اس ہجوم میں ایک شوکت ہاشمی بھی ہیں جو اب تک کئی پاپڑ بیل چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی بیوی پورنیما نے ان سے طلاق لی ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں بڑے دردناک بیان دے چکے ہیں۔ الکنندہ کئی ہاتھوں سے گذری اور آخر میں پربھات کے شہرت یافتہ ایکٹر بلونت سنگھ کے پاس پہنچی اس کے پاس وہ ابھی تک ہے یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔

ان تینوں بہنوں کی زندگی کی روئداد اگر لکھی جائے تو ہزاروں صفحے کالے کئے جا سکتے ہیں لوگ مجھے کوستے ہیں کہ میں فحش نگار ہوں گندہ ذہن ہوں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس دنیا میں کیسی کیسی ہستیاں موجود ہیں۔ میں انہیں فحش نہیں کہتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یا تو کوئی آدمی ماحول کے باعث مذموم حرکات کا مرتکب ہوتا ہے یا اپنی جبلت کے باعث۔

جو چیز آپ کو فطرت نے عطا کی ہے اس کی اصلاح نفسیاتی علاج

سے کسی حد تک ہو سکتی ہے لیکن اگر آپ اس سے غافل رہے ہیں تو اس کی ذمّہ داری کس پر عاید ہوتی ہے یہ ذرا سوچنے کی بات ہے۔

تارہ، ستارہ اور الکنندہ تین بہنیں کسی کے ہاں پیدا ہوئیں غالباً نیپال کے کسی گاؤں میں وہاں سے وہ ایک ایک کر کے بمبئی آئیں کہ فلمی دُنیا میں قسمت آزمائی کریں لیکن یہ مقدر کی بات ہے کہ صرف ستارہ کا ستارہ چمکا جو باقی دو تھیں وہ ٹمٹماتی رہ گئیں۔

ستارہ کے متعلق جیسا کہ میں اس مضمون کے آغاز میں کہہ چکا ہوں پوری تفصیل سے لکھتے ہوئے جھجکتا ہوں، وہ عورت نہیں کئی عورتیں ہے اس نے اتنے جنسی سلسلے کئے ہیں کہ میں اس مختصر مضمون میں اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

انگریزی زبان میں ایسی عورت کو NAFOMANIC کہا جاتا ہے، یہ عورت کی ایک خاص قسم ہے جو ایک مرد کے علاوہ اور سینکڑوں سے تعلق قائم کرتی ہے۔

ستارہ کا میں جب بھی تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بمبئی کی بارہ منزلہ بلڈنگ معلوم ہوتی ہے جس میں کئی فلیٹ اور کئی کمرے ہوں اور یہ واقعہ ہے کہ وہ بیک وقت کئی مرد اپنے دل میں بسائے رکھتی تھی مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب وہ بمبئی میں آئی تو اس کا تعلق ایک گجراتی فلم ڈائرکٹر سے قائم ہوا

جس کا پورا نام مجھے یاد نہیں رہا لیکن وہ ڈیسائی تھا۔ دبلا پتلا مریل قسم کا انسان،
لیکن تھا بہت خوبیوں کا مالک اپنے کام میں کافی ہوشیار تھا مگر قسمت نے
اس کی یاوری نہ کی۔ چونکہ ضدی تھا اس لئے جگہ جگہ ٹھکرایا گیا۔ اس سے
میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب سروج فلم کمپنی زندہ تھی ——
لیکن عمل میں زندہ درگور تھی۔ میری اس کی فوراً دوستی ہو گئی اس لئے کہ
وہ فن شناس تھا اور ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اسی دوران میں مجھے
معلوم ہوا کہ ستارہ اس کی بیوی ہے لیکن اس سے جدا ہو گئی ہے۔ ڈیسائی
کو مگر اس جدائی کا اتنا رنج نہیں تھا اس کی باتوں سے مجھے صرف اتنا معلوم
ہوا کہ وہ اس عورت سے پورا نبٹ نہیں سکتا تھا۔

ستارہ اس زمانے میں کسی اور کے پاس تھی لیکن کبھی کبھی اپنے شوہر
ڈیسائی کے پاس بھی آجاتی تھی، وہ خود دار انسان تھا اس لئے وہ اس
سے عموماً بے اعتنائی برتتا تھا اور اسے مختصر ملاقات کے بعد رخصت
کر دیا کرتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہب کے مطابق کوئی عورت طلاق نہیں لے سکتی ڈیسائی
سے ستارہ کی شادی ہندو قانون کے ماتحت ہوئی تھی اس لئے اب بھی
وہ مسز ڈیسائی ہے حالانکہ وہ کئی مردوں سے منسلک ہو کر ان سے علیحدگی
اختیار کر چکی ہے یہ اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب ناٹرکر شعبوب

کا ستارہ مائل بہ عروج تھا محبوب نے اسے اپنے کسی فلم میں لیا تو اس کے ساتھ ستارہ کے جنسی تعلقات فوراً قائم ہو گئے اس کی روداد میرا قلم بیان نہیں کر سکتا۔ صرف بو (عشرت جہاں) کی زبان ہی بیان کر سکتی ہے۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں محبوب کو حیدر آباد جانا پڑا تھا۔ وہاں محبوب صاحب حسب دستور باقاعدہ نماز پڑھتے تھے اور باقاعدہ ستارہ سے عشق فرماتے تھے۔ میں یہ سب کچھ لکھنے میں ہچکچا رہا ہوں۔ اصل میں ستارہ ایک "کیس ہسٹری" ہے اس پر نفسیات کے کسی ماہر ہی کو لکھنا چاہیے تھا۔ بمبئی میں ایک اسٹڈیو فلم سٹی تھا۔ محبوب نے غالباً اسی میں اپنی کوئی پکچر بنانا شروع کی تھی ان دنوں وہاں ساؤنڈ ریکارڈ کرنے والے مسٹر پی۔ این اروڑہ تھے (جو اب مشہور پروڈیوسر ہیں) بڑے محنتی قسم کے نوجوان تھے۔ فضل بھائی نے جو فلم سٹی کے کرتا دھرتا تھے ان کو ولایت بھیجا تھا کہ وہ صدا بندی کا کام سیکھ کے آئیں۔ اسی زمانے میں سیٹھ شہر از علی حکیم بھی وہیں تھے اور لیبارٹری کے انچارج تھے۔ ڈائرکٹر محبوب سے تو ستارہ کا سلسلہ چل رہا تھا لیکن بقول دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست دہلی اس کا ٹانکا پی۔ این اروڑہ سے بھی مل گیا۔

ڈائرکٹر محبوب نے فلم ختم کیا تو ستارہ پی۔ این اروڑہ کے ہاں بطور بیوی یا داشتہ کے رہنے لگی۔ لیکن اس دوران میں ایک اور حادثہ درپیش

آیا۔ فلم سٹی ہی میں یا کسی اور سٹوڈیو میں جہاں ستارہ کام کر رہی تھی) ایک
نو وارد النّاصر تشریف لائے۔ یہ بڑے خوبصورت جوان تھے کم عمر تازہ تازہ
ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے گال سُرخ و سپید تھے ان کو شوق تھا کہ
فلمی دُنیا میں داخل ہوں۔

جب آئے تو فوراً انھیں ایک فلم میں رول مل گیا اتفاق سے اس
کے کاسٹ میں ستارہ بھی شامل تھی جو بیک وقت پی این اروڑہ، ڈائرکٹر
محبوب اور اپنے اصلی خاوند مسٹر ڈیسائی کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔

معلوم نہیں یہ پہلے کی بات ہے یا بعد کی مگر ستارہ کی دوستی نذیر
سے بھی ہو گئی جس کی پہلی داشتہ جو کہ ایک بیودن ایکٹرس یاسمین تھی اسے
دارغ مفارقت دے گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کن حالات میں ان دونوں
کی ملاقات ہوئی لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان دونوں میں گاڑھی
چھننے لگی نذیر ستارہ کا فریفتہ تھا اور ستارہ نذیر پہ اپنی جان چھڑکتی تھی۔

میں نذیر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت سخت مزاج کا آدمی ہے
وہ عورت کو تابع رکھنے کا قائل ہے، عورت کا ذکر ہی کیا۔ مرد بھی جو اس کی
ملازمت میں ہوں انھیں اس کی گالیاں اور گھرکیاں سہنا پڑتی ہیں۔

وہ آدمی نہیں ولو ہے لیکن بڑا مخلص دیو وہ میرا دوست ہے جب
کبھی مجھ سے ملتا ہے سلام دعا کے بجائے گالیاں دیتا ہے لیکن میں جانتا ہوں

کہ وہ بے ریا ہے اس کا دل خلوص سے معمور ہے۔

اس بے ریا اور مخلص آدمی نے ستارہ کو کئی برس برداشت کیا۔ اس کی سخت گیر طبیعت کے باعث ستارہ کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے پرانے آشناؤں سے راہ و ربط قائم رکھے۔ لیکن وہ عورت جو صرف ایک مرد کی رفاقت پر قانع نہ رہتی ہو اس کا کیا علاج ہے۔ ستارہ نے کچھ دیر کے بعد وہی سلسلہ شروع کر دیا جس کی وہ عادی تھی۔ ادوڑہ النا محبوب اور اس کا خاوند ڈلیبائی سب ہی اس کے التفات سے مستفید ہوتے رہے یہ چیز نذیر کی خوددار طبیعت پر بہت گراں گزرتی تھی وہ ایسا آدمی ہے کہ ایک مرتبہ کسی عورت سے تعلق قائم کرے تو اسے نبھانا چاہتا ہے مگر ستارہ کسی اور ہی آب و گل کی بنی تھی وہ نذیر جیسے آدمی سے بھی مطمئن نہیں تھی۔

میں اس میں ستارہ کا کوئی قصور نہیں دیکھتا جو کچھ بھی اس سے سرزد ہوا سراسر اس کی جبلت کے باعث ہوا۔ قدرت نے اس کو اس طور سے بنایا ہے۔ کہ وہ بادۂ ہر جام ہی بنی رہے گی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی اس فطرت کے خلاف نہیں جا سکتی۔

یاسمین معتدل عورت تھی۔ خوبصورت، نسوانیت کا بڑا اچھا نمونہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے جب نذیر سے مستقل گھریلو زندگی بسر کرنے

کا ارادہ ظاہر کیا تو نذیر نے جسے ہزاروں اشخاص بہت سخت گیر سمجھتے ہیں یاسمین کو اجازت دے دی کہ وہ جس کسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے کر سکتی ہے ۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نذیر اور ستارہ کا جسمانی تعلق اتنی دیر کیسے قائم رہا ۔ نذیر سے میری ملاقات ہندوستان سینے ٹون میں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب فلم انڈسٹری نہایت نازک حالت میں تھی وہ اس وجہ سے فائنینسر سیٹھ ناز تھا آج لاکھوں کے مالک ہیں دوسرے دن دیوالہ پٹ رہا ہے ۔

ہندوستان سنے ٹون پہلے سروج فلم کمپنی تھی ۔ اس سے پہلے خدا معلوم اس کا کیا نام تھا ۔ میں نے ایک کہانی "کیچڑ" کے عنوان سے لکھی جب میں نے سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی کو سنائی تو اس نے بیحد پسند کی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں جب کہ حکومت کی طرف سے سخت قسم کا احتساب عاید تھا کوئی پروڈیوسر اس کہانی کو فلمانے کی جرأت نہ کرتا ، مگر نانو بھائی دلیر آدمی تھا اس نے کہانی لے لی مگر بعد میں مالی مشکلات درپیش آئیں تو وہ مجبور ہو گیا ۔

نذیر کے لئے میں نے مزدور کا ایک اہم رول لکھا تھا جو اس کو بہت پسند تھا ۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مالی مشکلات کے باعث یہ باغی فلم "

نہیں بنے گا۔ تو اس نے سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی سے کہا کہ آپ یہ کہانی مجھے دے دیجئے میں اپنا سب کچھ بیچ کر اس کے فلمانے پر لگا دوں گا۔ مگر ایسی نوبت نہ آئی نانو بھائی کو کہانی پسند تھی چنانچہ کسی نہ کسی طرح سرمائے کا بندوبست ہو گیا۔ فلم کے ڈائرکٹر دادا گنجال تھے ـــ گجراتی ـــ فلم مکمل ہو کر ریلیز ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی تعریف کی، پسند کیا۔ مگر میں مطمئن نہ تھا۔ لیکن اس کا میرے موضوع سے کوئی اتنا زیادہ تعلق نہیں۔ مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ اس دوران میں نذیر کو اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے میں یاسمین اس سے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ نذیر عزم کا مالک ہے اس نے بہت جلد اپنا ذاتی فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے اس کا پہلا فلم "سندیسہ" تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنا دوسرا فلم بنایا جس کا نام غالباً "سوسائٹی" تھا اس میں اس نے ستارہ کو بھی کاسٹ میں شامل کیا اور جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔ کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور بہت دیر تک رہے لیکن اس دوران میں جہاں تک میں جانتا ہوں ستارہ اپنے پرانے دوستوں کے ہاں بھی آتی جاتی رہی۔ پی۔ این اروڑہ کے پاس وہ اکثر جاتی تھی۔

ہیں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناؤں ۔ مجھے بمبئی چھوڑ کر دہلی جانا پڑا وہاں میں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی ۔ قریب قریب ایک سال تک میں بمبئی کی فلمی دنیا کے حالات وکوائف سے غافل رہا ایک دن اچانک میں نے نئی دلی میں ادوڑہ کو دیکھا ۔ ہاتھ میں موٹی چھڑی ۔ کمر دوہری ہو رہی تھی یوں بھی بیچارہ منحنی قسم کا انسان ہے مگر اس وقت بہت خستہ حالت میں تھا ۔ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں ۔ میں تانگے میں تھا اور وہ پیدل غالباً چہل قدمی کے لئے نکلا تھا ۔ میں نے تانگہ روکا اور اس سے پوچھا کہ یہ قصہ کیا ہے اس کا حلیہ کیوں اتنا بگڑا ہوا ہے ۔ اس نے ہانپتے ہوئے مگر ذرا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا وہ ستارہ ـــــ منٹو ستارہ " میں سب سمجھ گیا ۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی سمجھ جانا چاہیئے ۔ اب ایک اور لطیفہ سنیئے ۔ الناصر جو اب بہت موٹا اور بھدا ہو گیا ہے ۔ جب وہ شروع شروع میں فلم سٹی آیا تھا تو بہت خوبصورت تھا ، بڑا نرم و نازک ، سُرخ و سپید ڈیرہ دون کی پہاڑی فضا نے اس کو نکھار دیا تھا ، میں تو یہ کہوں گا کہ وہ نسائیت کی حد تک خوبصورت تھا اس میں وہ تمام ادائیں تھیں جو ایک خوبصورت لڑکی میں ہو سکتی ہیں میں جب دہلی میں ڈیڑھ برس گزارنے کے بعد سید شوکت حسین رضوی کے بلانے پر بمبئی پہنچا تو اس سے میری ملاقات مزوا مری ٹون میں ہوئی ۔ وہ

گیٹ کے باہر کھڑا تھا میں حیرت زدہ ہو گیا۔ گالوں کا گلابی رنگ ندارد۔ جسم پر پتلون ڈھیلی ڈھالی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکڑ گیا ہے نچڑ گیا ہے۔ میں نے اس سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "میری جان، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہے" اس نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر سرگوشی میں کہا "ستارہ ـــ میری جان ـــ ستارہ"

جہاں دیکھو ستارہ ـــ میں نے سوچا کہ یہ ستارہ صرف زردیاں پیدا کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے ادھر پی۔ این اوروڑہ انگلینڈ کا تعلیم یافتہ صدا بند، ادھر ڈیرہ دون اسکول کا پڑھا ہوا نوخیز لڑکا۔

الگ لے جا کر جب میں نے اس سے پوری تفصیل پوچھی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ ستارہ کے چکر میں پڑ گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا جب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک اس چکر میں رہا تو وہ ختم ہو جائے گا۔ تو وہ ایک روز ٹکٹ کٹا کر ڈیرہ دون چلا گیا، جہاں اس نے تین مہینے ایک سینے ٹوریم میں گذارے اور اپنی کھوئی ہوئی صحت کسی قدر حاصل کی، اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اس دوران میں مجھے ہندی زبان میں بڑے لمبے لمبے خط لکھتی رہی لیکن میں یہ خط پڑھ نہیں سکتا تھا البتہ ان کی آمد سے کانپ کانپ ضرور جاتا تھا اس نے پھر میرے کان میں کہا۔

"منٹو صاحب، بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔"

ستارہ اصل میں ہے ہی عجیب و غریب عورت ایسی عورتیں لاکھ میں دو تین ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کئی مرتبہ خطرناک طور پر بیمار ہوئی اس کو ایسے ایسے عارضے لاحق ہوئے کہ عام عورت کبھی جانبر نہ ہو سکتی مگر وہ ایسی سخت جان ہے کہ ہر بار موت کو غچہ دیتی رہی۔ اتنی بیماریوں کے بعد خیال تھا کہ اس کے ناچنے کی قوتیں سلب ہو جائیں گی مگر وہ اب بھی اپنے عہد جوانی کی طرح ناچتی ہے۔ ہر روز گھنٹوں ریاض کرتی ہے۔ مالشئے سے تیل کی مالش کراتی ہے اور وہ سب کچھ کرتی ہے جو پہلے کرتی آئی ہے۔ اس کے گھر میں دو نوکر رہتے ہیں، ایک مرد، ایک عورت۔ مرد عام طور پر اس کا مالشیا ہوتا ہے، جو عورت ہے اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ پرانی کہانیوں کی کٹنی معلوم ہوتی ہے جو آسمان میں تھگلی لگایا کرتی تھیں۔

وہ ململ کی باریک ساڑھی پہنتی ہے اتنی باریک کہ اس کا سارا ڈھیلا ڈھالا جسم اس میں سے چھن چھن کر باہر آتا رہتا ہے اور دیکھنے والوں کے لئے کراہت کا موجب ہوتا ہے۔ یہ عورت میں نے جب بھی دیکھی بہت کم گو، مگر بڑی تیز نظر دیکھی۔ اس کی عمر کم از کم پچپن برس کے قریب ہو گی مگر وہ جوانوں کے مانند چاق و چوبند تھی اس کی آنکھیں عقاب کی طرح دیکھتی تھیں۔

جب ستارہ اکیلی تھی ——— یعنی وہ کسی ایک کی ہو کے نہیں رہتی تھی

تو اس کا امکان وادر کے "خداداد سرکل" میں تھا اور جو صفتیں یا قباحتیں ستارہ میں ہیں وہ بھی خداداد ہیں۔ نا بہ جواب سورن لتا سے منسلک ہے، بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ اس نے بہت دیر تک ستارہ کو برداشت کیا مگر جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں وہ ایک مرد کی عورت نہیں ہے چنانچہ جب نذیر تنگ آ گیا اور اس کو حتمی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ اس سے نباہ نہیں کر سکتا تو اس نے ایک روز اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا "ستارہ مجھے بخش دو، مجھ سے جو غلطی ہو گئی ہیں اس کے لئے پشیمان ہوں اور تم سے معافی کا خواستگار ہوں"

نذیر ستارہ کو مارا پیٹا بھی کرتا تھا وہ اس سے ناخوش نہیں تھی ایسی عورتیں زدوکوب سے ایک خاص قسم کی جنسی لذت محسوس کرتی ہیں مگر ان سے منسلکہ مرد کب تک ہاتھا پائی کرتا رہے۔ وہ غریب بھی ایک عرصے کے بعد عاجز آ جاتا ہے۔ اب اسی سلسلے کی ایک اور کڑی کے متعلق بھی سنیئے جس زمانے میں ستارہ نذیر کے یہاں تھی اسی زمانے میں نذیر کا بھانجا کے آصف بھی وہیں تھا۔ کے آصف بڑا تومند نوجوان تھا، بڑا ہٹا کٹا جوانی سے بھرپور جس کو عورت ذات سے شاید کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا، اپنے ماموں کے ہاں رہتا تھا اور اس سے فلمی صنعت کے متعلق واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ دل میں سینکڑوں ولولے تھے، بڑے ارمان تھے، پھر فلمی دنیا میں آ کر

اس نے عورتوں (اور وہ بھی ایکٹرسوں) کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ماموں نذیر اور ستارہ کے باہمی تعلقات بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آصف کی جوانی پھوٹی پڑتی تھی یہ وہ دور تھا جب مرد اپنی جوانی کے جوش میں پتھروں کی دیوار سے بھی بھڑ جانا چاہتا ہے۔ اور ستارہ یقیناً ایک پتھریلی دیوار تھی جو کسی سے ٹکرانا چاہتی تھی۔

نذیر اس زمانے میں رنجیت فلم اسٹوڈیو کے عین سامنے ایک احاطے کے اندر رہتا تھا۔ بڑی غلیظ سی جگہ تھی۔ نذیر نے ایک پورا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اسی میں اس کی قائم کی ہوئی "ہند پکچرز" کا دفتر بھی تھا۔ دو تین کمرے تھے۔ ان میں تخلیہ کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پرجوش نوجوان آصف کو ہر وہ پہلو دیکھنے کا موقعہ ملا جو مرد و زن کے باہمی تعلقات سے وابستہ ہوتا ہے۔

نوجوان آصف کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ بڑا حیرت انگیز۔ اس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے ازدواجی زندگی کے اسرار کئی بار سنے تھے مگر اسے کبھی تعجب نہیں ہوا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ایک بستر ہوتا ہے جس پر انسانی فطرت اپنا ازلی و ابدی کھیل کھیلتی ہے۔ مگر آصف کی آنکھوں نے جو کچھ ایک بار محض اتفاق سے دیکھا وہ بالکل مختلف تھا۔ بڑا خوفناک جس نے اس کی ہڈی ہڈی جھنجھوڑ دی۔ اُس نے کئی بار کتوں کی لڑائی

دیکھی تھی جو ایک دوسرے سے بڑے وحشت ناک طریقے پر گتھ جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے، بھنبھوڑتے، کاٹتے اور نوچتے تھے۔

اس کا تن بدن لرز گیا! اس نے سوچا یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔ اصل میں انسان درندہ ہے اور اس کی محبت ایک بڑی خوفناک قسم کی کشتی مگر اس کو اکھاڑے میں اترنے اور ایسی کشتی لڑنے کا شوق ضرور تھا اس کے بازوؤں میں قوت تھی، اس کے بدن میں حرارت تھی، اس کے تمام پٹھے فولادی تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ صرف ایک بار اسے موقعہ دیا جائے تو وہ حریف کو چاروں شانے چت گرادے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر نذیر پاکستان کا ذہین مگر بدقسمت ڈاکٹر بھی نذیر کے ساتھ تھا۔ آصف اور وہ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں کنوارے اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والے، آپس میں ملتے تو وہ عورتوں کی باتیں کرتے، ان عورتوں کی جو مستقبل میں ان کی ہونے والی تھیں پر جب ستارہ کا ذکر آتا تو دونوں کانپ اٹھتے اور ایک ایسی دنیا میں چلے جاتے جہاں جن، دیو اور چڑیلیں رہتی ہیں۔

ان کو کیا معلوم کہ "نمفومینک" عورت کیا ہوتی ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ ستارہ کے مقابلے میں ایسی عورتیں بھی ہیں جنھیں اگر برف کی سل کہا جائے تو بجا ہے۔

لیکن ان کو یہ تو معلوم تھا کہ ستارہ نذیر کے ساتھ وفادار نہیں وہ ہرجائی ہے ۔یوں تو نذیر کی فل ٹائم داشتہ کے طور پر رہتی ہے مگر پی۔این اروڑہ کے پاس بھی جاتی ہے اور کبھی کبھی اپنے پتی ڈیسائی کے پاس بھی جو بیچارہ بڑے حسرت کے دن گذار رہا تھا ـــ اور پھر اور بھی تھے جن میں الناصر بھی شامل تھا۔

دونوں چکرائے چکرائے رہتے تھے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ نذیر کے بستر کی ہر شکن کا پس منظر ان کو معلوم تھا۔ نذیر کے کھردرے اور گہرے سانولے رنگ کے چہرے کی گینڈے ایسی سخت کھال پر جو لئے دن داغ دھبے پڑتے تھے اس کا جواز بھی ان کو معلوم تھا۔ لیکن اس قدر دونوں کو یقین تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلے گا مگر وہ چلتا رہا اپنے معمول کے مطابق۔

صبح سویرے ستارہ اُٹھتی اور دوسرے کمرے میں ریاض شروع کر دیتی۔ یہ بھی حیرت ناک چیز تھی کہ صبح اُٹھتے ہی دو گھنٹے لگاتار درویشوں کی مانند ناچتی رہے۔ ایسے ایسے توڑے لے کہ زمین گھوم جائے۔ طبلچی کے ہاتھ شل ہو جائیں۔ مگر اسے کچھ نہ ہو۔ ریاضت کے بعد وہ اپنے ایک مخصوص مالشیئے سے مالش کراتی تھی اس کے بعد نہا دھوکر وہ نذیر کے کمرے میں جاتی جو کہ سو رہا ہوتا۔ اس کو جگاتی اور اپنے ہاتھ سے دودھ

یا خدا معلوم کس چیز کا ایک پیالہ اسے زبردستی پلاتی۔ اور ایک دوسرا ناچ شروع ہو جاتا۔ یہ سب کچھ آصف اور نیر کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ان کی عمر تجسس کی عمر تھی جب آدمی خالی کمروں میں بھی خواہ مخواہ کھڑکی کی درزوں سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ روشندانوں سے بھرے کمروں کا جائزہ لیتا ہے۔ ذرا سی آواز آنے پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ ان میں معانی بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیر آصف کے مقابلے میں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔ اس کی جنسی خواہشیں بھی اسی لحاظ سے معتدل تھیں مگر آصف کے مضبوط اور تنومند جسم کی رگ رگ میں بجلی بھری ہوئی تھی جو کسی پہ گرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے آصف چاہتا تھا کہ اندھیری رات ہو، آسمان پر کالے بادلوں کا ہجوم ہو، کان بہرے کر دینے والی بجلی کی کڑک اور طوفان باد و باراں میں وہ کسی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے اور اسے کھینچتا کہیں دور لے جائے جہاں پتھروں کا بستر ہو۔

نذیر کا عزیز ہونے کے باعث ستارہ گھنٹوں آصف کے پاس بیٹھی رہتی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا آصف کا حجاب کم ہوتا گیا جو وہ لاہور سے اپنے ساتھ لایا تھا مگر اس کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ستارہ کو ہاتھ لگاتا۔ کیونکہ وہ اپنے ماموں کی سخت گیر طبیعت سے واقف تھا اور اس سے ڈرتا تھا — لیکن

اس دوران میں اتنا جان گیا تھا کہ ستارہ اس کی طرف مائل ہے۔ وہ جب بھی چاہے اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ کر اسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے ۔۔۔۔ مگر وہ گھپ اندھیری رات، وہ طوفانِ بادوباراں اور وہ پتھروں کا بستر!

آصف جھنجھلا رہا تھا کہ قدرت اتنی تعویق کیوں کر رہی ہے جو ہونا ہے آج ہی کیوں نہیں ہو جاتا۔ گاڑیاں جنھیں کل ایک دوسرے سے ٹکرانا ہے، آج ہی کیوں نہیں ٹکرا جاتیں، مگر یہ کیسے ہوتا جب کانٹا بدلنے والا کانٹا نہ بدلتا۔

وہ دو گاڑیوں کی طرح ایک پلیٹ فارم پر رکتے تھے مگر ان میں فاصلہ ہوتا تھا۔ بہت معمولی سا فاصلہ۔ مگر جس طرح ایک گاڑی دوسری گاڑی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی اسی لئے کہ وہ اپنی اپنی پٹریوں کے ساتھ جکڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ بھی ایک دوسرے سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے۔

جس طرح اِدھر کے مسافر اُدھر کے مسافروں سے کھڑکیوں میں سے سر باہر نکال نکال کر باتیں کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی کرتے تھے، مگر فوراً ایک گاڑی اُدھر روانہ ہو جاتی اور دوسری اِدھر، آصف کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ مگر وہ گھپ اندھیری رات اور طوفانِ بادوباراں

کا منتظر تھا۔

آخر وہ گھپ اندھیری رات، طوفان بادوباراں، رعدوبرق کی جملہ ہولناکیوں کے ساتھ آ ہی گئی۔

بالآخر ستارہ کے کرتوت دیکھ کر نذیر بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

نذیر کے سر سے اب پانی گذر چکا تھا۔ کافی لعن طعن کے بعد اُس نے ستارہ سے کہا کہ اب تم یہاں سے نہیں رہ سکتیں۔ اپنا بستر فوراً گول کرو۔

ستارہ، کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات ہے۔ نذیر کی سرزنش کے بعد اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کہ وہ اکیلی اپنا بستر گول کر سکتی۔ نذیر سے وہ کیسے مدد مانگتی۔ وہ غصے میں بپھرا، منہ میں جھاگ نکالتا باہر نکل کر اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ آصف نے اُس کے یہ تیور دیکھے تو اُس کو یقین ہو گیا کہ وہ اندھیری رات آ گئی۔

تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا، اُس کے بعد اُٹھا اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں ستارہ پلنگ پر بیٹھی اپنی چوٹیں سہلا رہی تھی۔

چند باتوں ہی سے اُس کو معلوم ہو گیا کہ معاملہ ختم ہے۔ دل ہی دل میں وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اُس نے ستارہ کو ڈھارس دی، کچھ اس طرح

پر کہ ایک نیا معاملہ شروع ہو گیا۔

آصف نے اس کا بستر لور یا باندھا اور اس کے ساتھ اُس کے گھر واقع داور (خداداد سرکل) چھوڑنے گیا۔

یہاں ستارہ نے آصف کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

آصف نے جرأت سے کام لے کر ستارہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "اس کی کیا ضرورت تھی ستارہ ـــــ"

ستارہ نے اپنا ہاتھ آصف کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش نہ کی، مگر آصف مطمئن نہ تھا۔ تھوڑی دیر راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، ستارہ نے آصف کو اپنے اُس سحر کا نمونہ بھی چکھایا، جس سے وہ اس وقت تک سینکڑوں مرد، دبلے پتلے، ہٹے کٹے، صندی اور وحشی اپنی خواہشات کا غلام بنا چکی تھی۔

اگر دن ہوتا تو آصف کو یقیناً تارے نظر آجاتے ہوں گے۔ رات کو اُسے خداداد سرکل کے اس فلیٹ میں دن طلوع ہوتا نظر آیا ـــــ اُس کی سرتوں کا دن۔ مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اُس نے ستارہ سے کہا کہ دیکھو، تمہارا میرا سمبندھ بہت مضبوط ہونا چاہیے۔ ہرجائی پن چھوڑو۔ بس ایک کی ہو جاؤ۔

ستارہ نے اُسے یقین دلایا کہ وہ آصف کے سوا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر

بھی نہ دیکھے گی۔ آصف مطمئن ہو گیا۔ مگر اس خوف سے کہ ندیر اُس سے اتنی دیر لگانے کی وجہ نہ پوچھ بیٹھے۔ عاشقِ صادق کی طرح اُس کا ہاتھ چوم کر چلا گیا، اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے روز ضرور آئے گا۔

وہ گیا، تو ستارہ اُٹھی، سنگار میز کے پاس جا کر اُس نے اپنے بال درست کئے۔ ساڑھی تبدیل کی اور کسی کی طرف آنکھ اُٹھائے بغیر نیچے اُتری اور ٹیکسی لے کر پی، این اردوڑہ کے پاس چلی گئی۔

جملہ معترضہ ہے۔ لیکن ہُوا کرے۔ کہنا یہ ہے کہ ستارہ کو مجھ سے سخت نفرت تھی۔ میں مصور کا ایڈیٹر تھا اور بے لاگ لکھتا تھا۔ بال کی کھال، اور نت نئی کے کالموں میں کئی بار میں نے اُس کی درگت بنائی تھی۔ لیکن بڑے سلیقے سے۔ اس میں کوئی سوقیانہ پن نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ناراض تھی۔ اور مجھے اس ناراضی کی سچ پوچھئے تو کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ مجھے اُس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اور یوں بھی فلمی ہستیوں سے دُور دُور ہی رہتا تھا۔

میں نے "نت نئی" یا بال کی کھال کے کالموں میں جب ندیر اور اُس کی لڑائی کا ذکر ذرا نمک مرچ لگا کے کیا تو وہ بہت سیخ پا ہوئی اور اُس نے مجھے خوب گالیاں دیں۔

اس کے بعد جب مجھے اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے آصف

اور اُس کے خفیہ معاشقے کا پتہ چلا اور میں نے چھپتے ہوئے اشاروں اور کنایوں میں اس کا ذکر اپنے کالموں میں کیا تو وہ بھنا گئی اور اُس نے آصف سے کہا، تم اس شخص کو پیٹتے کیوں نہیں، خود نہیں پیٹتے تو کسی سے پٹواؤ۔ یا کسی اور اخبار والے سے کہو کہ وہ اسے اپنے اخبار میں ڈھیروں گالیاں دے۔

آصف، بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اُس میں بردباری ہے۔ تحمل ہے مذاق سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، حالانکہ ان پڑھ ہے۔ اُس نے ستارہ کی یہ باتیں اس کان سنیں اُس کان نکال دیں۔

معاملہ اب زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ستارہ کس قسم کی عورت ہے۔ اگر اُس سے کسی مرد کا واسطہ پڑ جائے تو اُس کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ فقط ایک الناصر ہی تھا۔ جو چند ماہ اُس کے ساتھ گذار کر ڈیوہ دمن بھاگ گیا۔ ورنہ ایک روز اُس کی انتڑیاں بالکل جواب دے دیتیں اور اُس کی قبر بمبئی کے قبرستان میں بنی ہوتی۔ جس کے کتبے پر کچھ اس قسم کا شعر مرقوم ہوتا ۔

لحد پہ مری وہ پردہ پوش آتے ہیں
چراغِ گورِ غریباں، صبا بجھا دینا

ہاں تو معاملہ بہت نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ اس لئے کہ نذیر کے دل

میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا۔ یہ میرا بھانجا، اتنی اتنی دیر کہاں غائب رہتا ہے۔ جب وہ اس سے پوچھتا تو وہ کوئی بہانہ پیش کر دیتا۔

مگر یہ بہانے کب تک چلتے۔ ان کا سٹاک ایک روز ختم ہونا ہی تھا۔

نذیر کے دل میں ستارہ کے لئے اب کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ایسا آدمی نہیں کہ اپنا فیصلہ تبدیل کرے۔ اُس کو ستارہ کی نہیں آصف کی فکر تھی۔ اپنے بھانجے کی جس کو وہ اپنا عزیز سمجھتا تھا۔ اور جس کو اُس نے صرف اس غرض سے اپنے پاس رکھا تھا کہ وہ کچھ بن جائے۔

البتہ اس کو فکر تھی کہ وہ کہیں اُس عورت کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ وہ اس عورت کے ساتھ کئی برس گذار چکا تھا۔ اُس کی رگ رگ اور نخ نخ سے واقف تھا اُس کو معلوم تھا کہ آصف جیسے نوجوان اس کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ اور اُن کو اپنے دام میں پھنسانا اس ایسی تجربہ کار عورت کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لطف کی بات تو یہ ہے۔ کہ وہ خود بخود اُس کے دام کے نیچے آجاتے تھے۔ ایک بار پھنس جاتے تو پھر رہائی مشکل ہو جاتی تھی۔

ستارہ سے کسی مرد کا سابقہ پڑ جائے اور اتفاق سے وہ ستارہ کو پسند آجائے تو پھر دن اور رات کا بیشتر حصہ اُسی کے ساتھ کاٹنا پڑتا ہے۔

نذیر کو آصف کی پے در پے غیر حاضریوں ہی سے پتہ چل گیا تھا۔ مگر جب آصف کہتا کہ ماموں جان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اس کے متعلق

تو سوچ بھی نہیں سکتا، تو وہ شش و پنج میں پڑ جاتا۔ لیکن دل میں اُسے پورا یقین تھا کہ یہ لونڈا پھنس چکا ہے۔ اور جھوٹ بول رہا ہے۔

آصف واقعی جھوٹ بول رہا تھا۔ معاملہ اگر کسی اور عورت کا ہوتا تو وہ یقیناً کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ مگر ستارہ، اُس کے ماموں کی داشتہ تھی۔ اُس کے ساتھ وہ ایسے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تعلقات جو قائم ہو چکے تھے۔

پیچھے ہٹنا اور فرار اب بہت مشکل تھا۔ آصف اِس ذہنی شکنجے کی گرفت میں تھا۔ بھاگ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اُدھر نذیر کی آنکھوں میں بڑا برخون اُتر رہا تھا۔ اُس کو بس ایک موقع چاہیے تھا۔ ایسا موقع کہ وہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ایک روز نذیر نے وہ سب کچھ دیکھ بھی لیا جو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ مجھے سارے واقعات اچھی طرح معلوم تھے۔ مگر اب اتنا عرصہ گذر گیا ہے کہ بہت سی باتیں ذہن سے اُتر گئی ہیں۔ وہ خون جو نذیر کی آنکھوں میں ایک عرصے سے اُتر رہا تھا۔ وہ اُس وقت پی گیا اور اُن دونوں پر ٹوٹ پڑا۔

آصف نے اپنے ماموں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ دونوں بے گناہ ہیں۔ اُن کے درمیان ایسا کوئی رشتہ، ایسا کوئی

تعلق نہیں جس کے لئے انہیں موردِ عتاب بنایا جائے۔ لیکن نذیر اُس وقت کچھ بھی سُننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مار مار کے اُن دونوں کی ہڈی پسلیاں توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ سارا قصّہ ہی ختم ہو۔ مگر مجید (مشہور ایکٹر جو اب پاکستان میں ہے۔) نے بڑی ہوشیاری سے بیچ بچاؤ کر دیا۔

نذیر مان گیا۔ وہ بہت کم کسی کی مانا کرتا ہے مگر اُن دنوں مجید انگی کی عادت کے مطابق اُس کی "اچھی کتابوں میں تھا"

مجید کو آصف اور ستارہ کے معاشقے کا علم تھا۔ سُنا ہے کہ اُس نے آصف کو کئی بار متنبہ کیا تھا کہ وہ اس خطرناک کھیل سے باز آجائے مگر جوانی کے وہ دیوانے دن جن میں سے آصف کی زندگی گذر رہی تھی۔ نہ مانے اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ راز جن کو وہ اپنی دانست کے مطابق پردے دبیز پردوں کے اندر چھپائے بیٹھے تھے۔ فاش ہو گیا۔

نذیر جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں بہت سخت گیر آدمی ہے۔ مگر ایسے بہت کم آدمی ہیں۔ جن کو معلوم ہے کہ وہ نرم دل بھی ہے۔ جو کام وہ خود کرتا ہے۔ اُس کی اچھائی بُرائی کا شعور رکھتا ہے۔ جو اوسط درجے کا آدمی نہیں رکھتا۔ وہ ستارہ سے ایک عرصے تک جسمانی طور پر وابستہ رہا، لیکن وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ یہ وابستگی آصف کی ستارہ سے بھی ہو۔

آصف اُس کا بھانجا تھا۔ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اسی رشتے کی بنا پر آصف اور ستارہ کا ملاپ پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر میں جو نذیر کے کردار کے تمام ٹیڑھے ترچھے زاویوں سے واقف ہوں، وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آصف کے بجائے کوئی اور آدمی ہوتا۔ تو وہ اُس سے بھی یہی کہتا کہ دیکھیں اس عورت سے بچو۔ ایک صرف میں ہی تھا۔ جسے اپنی توانائی اور قوت پر ناز تھا لیکن میں بھی ہار گیا۔

نذیر خلوص کا پتلا ہے۔ ایک ایسے خلوص کا جو ہر وقت بڑا درشت اور کھردرا لباس پہنے رہتا ہے۔

نذیر نے مجید کے کہنے پر ستارہ اور آصف دونوں کو چھوڑ دیا۔ اس لئے بھی کہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلایا تھا۔ کہ اُن دونوں کے تعلقات بالکل پاک اور صاف ہیں۔

نذیر چلا گیا۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ بظاہر وہ ایک اکھڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شئے لطیف سے کورا، مگر وہ دوسروں کے دل کی گہرائیوں میں ایک ماہر غوطہ زن کی طرح اُتر سکتا ہے۔ اور پھر وہ ستارہ کی ایک ایک رگ سے واقف تھا۔ اور جس عمر سے آصف گذر رہا تھا۔ اُس میں تو وہ کھیلا کھیں لگاتا گذر چکا تھا۔ اس نے ایسی کئی منزلیں دیکھی تھیں جو آصف شاید ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکے —— وہ مطمئن نہیں تھا۔

اس حادثے کے بعد آصف اور ستارہ کے درمیان کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ وعدے وعید ہوئے۔ قسمیں کھائی گئیں کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد آصف نے سچے عاشقوں کے انداز میں ستارہ سے رخصت لی اور چلا گیا۔

ستارہ نے اپنا میک اپ درست کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور ٹیکسی منگوا کر بی۔ این اروڑہ کے پاس چلی گئی، جس کی صحت دہلی کے حکیموں کے علاج سے اب کسی قدر بحال ہو چکی تھی۔ اور اس کے پچکے ہوئے گالوں میں تھوڑا سا گوشت آ گیا تھا۔

الناصر بھی تھا۔ ڈاکٹر محبوب بھی تھے۔ اور خدا معلوم اور کتنے تھے آصف گو ایک بہت ہی کڑے مرحلے سے گذر چکا تھا۔ مگر اس نے ستارہ کے یہاں اپنی آمد و رفت یکسر منقطع نہ کی۔ اور وہ کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ پرانی جادوگرنیوں کی طرح اس جادوگرنی نے آصف کو ایک مکھی بنا کر اپنی دیوار کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ اب صرف نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ پرانی کہانیوں کا کوئی شہزادہ سلیمانی تعویذ کے ذریعے سے اُس جادوگرنی کا مقابلہ کرتا اور انجام کار آصف اُس کے چنگل سے نکلتا۔

میں جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ طاقتور سے طاقتور سلیمانی تعویذ بھی ستارہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک ایسا حصار ہے جسے

لندھور بھی سر نہیں کر سکتا۔

یہ چکر یونہی چلتا رہا۔ نذیر اور آصف کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ہاں میں ایک بات کہنا بھول ہی گیا۔ جب نذیر نے ستارہ کا بستر گول کیا تھا۔ تو رفیق غزنوی مشہور میوزک ڈائریکٹر نے مفاہمت کی کوشش کی۔ اس نے ستارہ، ادرذرہ اور نذیر کو اپنے یہاں بلایا۔ شراب کے دور چلے۔ رفیق نے جو گفتار کا غازی ہے بڑے فلسفیانہ انداز میں گپ شراب کے علاوہ پلائے۔ مگر کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور جب کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو خود بخود ایک صورت پیدا ہو گئی۔ رات بھر ستارہ رفیق کے فلیٹ میں رہی اور وہ اس کو سمجھاتا رہا کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

عجیب بات ہے کہ رفیق نے پھر مفاہمت کی کوشش نہ کی اور نہ ستارہ اس کے یہاں رات کو یہ سننے کے لئے گئی کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ شاید اس لئے کہ ستارہ کے کسی توڑے میں رفیق کو ایک دو ماترے کم محسوس ہوئے ہوں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ستارہ نے یہ محسوس کیا ہو کہ رفیق سُر سے ایک آدھ سُر اوپر یا نیچے گاتا ہے...... اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اب ہم پھر ستارہ اور آصف کی طرف پلٹتے ہیں۔ ستارہ اس پر بہت

بُری طرح لٹو تھی۔ کہ وہ نوجوان خاکسار تھا۔ اُس کی زندگی میں ستارہ شاید سب سے پہلی عورت تھی۔

کہا جاتا ہے کہ نذیر نے ایک بار پھر چھاپہ مارا اور دونوں کو عین موقع پر جا پکڑا۔ اس دفعہ کس نے بیچ بچاؤ کیا۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ بہرحال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کیونکہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلا دیا کہ اُس کے اور ستارہ کے درمیان ایسی ویسی کوئی بات نہیں، بہرحال آصف اور ستارہ کے سر سے آئی بلا ایک دفعہ پھر ٹل گئی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن آصف غائب ہو گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ستارہ بھی غائب ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ کسی تیرتھ کی یاترا کرنے گئی ہے۔ اگر موسم حج کا ہوتا تو یار لوگ یقیناً اُڑا دیتے کہ حضرت آصف حج کرنے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں وہ دونوں کہاں گئے تھے۔ مگر دہلی سے خبر موصول ہوئی کہ ستارہ مشرف با اسلام ہو چکی ہے۔ اور اُس کا اسلامی نام اللہ رکھی رکھ گیا ہے۔ اور یہ کہ آصف نے اُس سے باقاعدہ نکاح پڑھوا لیا ہے۔

اُس کے ماموں نذیر پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا اُس کے متعلق آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ مگر پُر لطف بات یہ ہے۔ کہ ہندوؤں کے قانون کے مطابق طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔ عورت ایک دفعہ کسی مرد سے وابستہ ہو جائے تو سو حیلے کرنے پر بھی خود کو اپنے پتی سے جدا نہیں کر سکتی۔ یوں وہ آوارہ گردی

کر سکتی ہے۔ سینکڑوں مردوں کی آغوش کی زینت بن سکتی ہے مگر رہے گی اپنے پتی کی پتنی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہندو عورت چاہے دوسرا مذہب اختیار کرلے مگر اس کی اصل پوزیشن میں فرق نہیں آسکتا۔ اس لحاظ سے گو ستارہ اللہ رکھی بن کر بیگم کے آصف ہوگئی تھی مگر قانون کی نظروں میں وہ مسز ڈیسائی تھی۔ اُس بیچارے صورت ڈیسائی کی بیوی جو روٹی کمانے کے لئے بہت بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

جب اس خبر کی تصدیق ہوگئی تو میں نے معتوّر کے کالموں میں جی بھر کے لکھا۔ قریب قریب ہر ہفتے اس نئے بیاہتا جوڑے کا ذکر ہوتا تھا۔ بڑے طنزیہ ترچھے اور ڈنکا ہیبہ انداز میں۔

ماہ عسل یعنی ہنی مون منانے کے بعد جب یہ جوڑا بمبئی واپس آیا تو نذیر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ ایک دفعہ مجھے ریس کورس جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہجوم میں سے آصف شارک سکن کے بے داغ سوٹ میں ملبوس، پھر پتلی ستارہ کی کمر میں ہاتھ دیئے چلا آرہا ہے۔ جب وہ میرے قریب پہنچا۔ تو وہ پہلے مسکرایا، پھر ہنسنے لگا۔ اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا "بھئی خوب —— بہت خوب۔ نمک مرچ اور بال کی کھال کے کالموں میں تم جو لکھ رہے ہو، خدا کی قسم لاجواب ہے"!

ستارہ تیوری چڑھا کر ایک طرف ہٹ گئی مگر آصف نے اس

طرف کوئی توجہ نہ کی اور مجھ سے بڑے بلند بانگ خلوص کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اور ان پڑھ ہونے کے باوجود مزاح اور فکاہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اب بمبئی میں ہر شخص کو جسے فلمی صنعت سے دلچسپی تھی، معلوم ہو چکا تھا کہ کوئی آصف ہے، جس سے ستارہ نے شادی کر لی ہے۔ بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ کے ایرانی ہوٹلوں میں پنجاب اور یو۔ پی کے مسلمان جو مسلم لیگ کی حمایت میں تھے۔ چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ کہ میاں بھائی (مسلمان) نے ایک کافر عورت کو مسلمان کر کے اپنے عقد میں لے لیا۔

بعض کہتے تھے۔ کہ آصف کو اب اُس سالی سے ایکٹنگ نہیں کرانی چاہیے۔

بعض کہتے تھے۔ کوئی واندہ (حرج) نہیں مگر جب باہر نکلے تو پردہ ضرور کیا کرے۔

بعض کہتے تھے ہٹاؤ یار — یہ سب اسٹنٹ ہے۔

بہر حال جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آصف ستارہ سے قانونی طور پر شادی کر چکا تھا، مگر ایک عرصے کے بعد جب میں نے اس سے پوچھا، کیوں

دھانسو کیا واقعی ستارہ تمہاری منکوحہ بیوی ہے" تو وہ ہنسا" کیسا نکاح اور کیسی شادی"۔

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ اصل معاملہ کیا تھا اور کیا ہے۔

آصف کا اپنا مکان کرئی بھی نہیں تھا۔ بس دونوں وہیں خداداد سرکل (دادر) میں رہتے تھے۔ اور کھلے بندوں رہتے تھے۔ ستارہ کی موٹر بھی اُس میں گھومتے تھے۔

میرا خیال ہے، دہلی میں آصف نے شاید لالہ جگت نرائن کو اس بات پہ آمادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اُسے ایک فلم بنانے کا سرمایہ دے۔ اُس سے شاید اُس نے کچھ ایڈوانس بھی لیا ہوگا۔ جبھی تو وہ تنگدست نہیں تھا۔

آصف میں ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ کہ خود اعتمادی ہے۔ اُس کے اندر احساس کمتری کا شائبہ تک موجود نہیں۔ وہ بڑے بڑے ڈائرکٹروں اور سٹوری رائٹروں کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔ محض اپنی خداداد قابلیت کی بدولت۔ اس خداداد قابلیت کو میں ہاؤس سنس، کہا کرتا تھا۔ آصف کے سامنے بھی۔ مگر اُس نے کبھی بُرا نہ مانا۔

آصف جب ڈائرکٹر بنا تو دوسرے تنگ خیال اور کم ظرف ڈائرکٹروں کے مانند اُس نے اپنا حلقۂ فکر و نظر محدود نہ رکھا۔ اُس نے ہر دماغ کو دعوت دی کہ وہ کوئی اچھی چیز پیش کرے اسے وہ بخوشی قبول کرے گا۔

میں خدا معلوم کہاں کا کہاں چلا گیا ہوں مگر یہاں مجھے ایک لطیفے کا ذکر کرنا اس لئے دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ میری ذات سے متعلق ہے۔

آصف اُن دنوں "پھول" بنا رہا تھا۔ میں اپنے فلیٹ واقع کلیئر روڈ میں تھا کہ نیچے سے موٹر کے ہارن کی تابڑتوڑ آوازیں آئیں۔ میں نے باہر بالکنی میں نکل کر دیکھا۔ ایک بہت بڑی موٹر نیچے کھڑی تھی۔ جب میں جنگلے پر جھکا تو پچھلی سیٹ سے آصف نے کھڑکی میں سے اپنا ورزنی سر باہر نکالا اور مسکرایا۔

میں نے اُس سے کہا "آؤ، کیا بات ہے؟"

اُس نے دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ستارہ سے کچھ کہا، اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا "آتا ہوں اور بتاتا ہوں"

لمبی چوڑی موٹر کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ چشم زدن میں ڈلی چیمبرز کے احاطے سے باہر نکل گئی۔ آصف نے سیڑھیوں کا رُخ کیا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک منٹ میں آصف اندر داخل ہوا اور بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا "میں تمھیں اپنی کہانی سنانے آیا ہوں"

میں نے ازراہِ مذاق کہا "تمھیں معلوم ہے۔ میں فیس لیا کرتا ہوں"

آصف نے کچھ نہ کہا، مجھ سے ہاتھ ملایا اور اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ میں نے اُس کو آوازیں دیں۔ اُس کے پیچھے دوڑتا گیا مگر اُس نے میری

ایک نہ سُنی۔ بس اتنا کہا کہ وہ فیس لے کر آئے گا۔ تو کہانی سنائے گا۔ ورنہ نہیں۔

میں بہت پشیمان ہوا کہ میں نے اُس سے ایسا مذاق کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ میری اس بات کو اُسی رنگ میں لے گا جس رنگ میں وہ کہی گئی تھی مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا اور وہ چلا گیا۔

میں اُدھر آیا اور اپنی بیوی سے سارا قصہ بیان کیا۔ تو اُس نے صاف لفظوں میں کہا کہ یہ میری عین حماقت تھی۔ اس لئے کہ اشفاق میرا بے تکلف دوست نہیں تھا۔ اور یہ واقعہ ہے۔ کہ اُس کے اور میرے مراسم کچھ زیادہ نہیں تھے۔ چونکہ وہ اور میں طبعاً صاف گو۔ دل شکن حد تک صاف گو ہیں۔ اس لئے میں نے جب اُس سے فیس کا مذاق کیا تھا۔ تو میرے دل و دماغ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے مجھے اُس کے جذبات مجروح کرنا مطلوب تھے۔ اور نہ میں ایسا بنیا ہوں کہ اُس سے پہلے ہی روپے کا تقاضا کرتا۔ مجھے تو صرف کہانی سننا تھی۔ اور بس۔

اور میں کئی ڈائرکٹروں سے اُن کی تھرڈ کلاس کہانیاں ایک نہیں چار چار مرتبہ سُن چکا تھا۔ کیونکہ وہ میری لڑائی کے طالب ہوتے تھے۔ میں نے اُن سے کبھی اپنے وقت کی (جو کہ ظاہر ہے ضائع ہوتا تھا) قیمت طلب نہیں کی تھی۔

مجھے افسوس تھا۔ کہ میں نے آصف کو ناراض کیا۔ میں اُس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا۔ ایک آدمی کھڑا تھا۔ اُس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور چلا گیا۔ میں ابھی لفافہ کھول ہی رہا تھا۔ کہ نیچے سے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے بالکنی میں جاکر دیکھا۔ ستارہ کی کار تھی۔ اور وہ اوٹلفی چیمبرز کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

لفافہ کھول کر میں نے دیکھا کہ سو سو کے پانچ نوٹ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک مختصر سی تحریر تھی۔ "فیس حاضر ہے۔ اب میں کل آؤں گا"

میں بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب وہ اُسی کار میں آیا۔ ستارہ ساتھ تھی۔ مگر وہ اُوپر نہ آئی۔ آصف کو دستک دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، اس لئے کہ دروازہ کھلا تھا۔ اور میں اُس کے استقبال کے لئے دہلیز میں کھڑا تھا۔

اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "کیوں ڈاکٹر صاحب فیس مل گئی آپ کو؟"

میں بہت شرمندہ ہوا۔ جس کا اظہار میں نے بڑے پُرخلوص اور موزوں و مناسب الفاظ میں کیا۔ اور وہ پانچسو اُس کو واپس کرنا چاہے۔

آصف اپنے مخصوص انداز میں ہنسا اور صوفے پر اپنی نشست جما کر

کہنے لگا یہ منٹو صاحب۔ آپ کس خیال میں ہیں۔ یہ پیسہ میرا ہے۔ نہ میرے باپ کا۔ پروڈیوسر کا ہے۔ غلطی میری تھی۔ جو میں بغیر فیس کے چلا آیا۔ حالانکہ میری نیت واللہ ہرگز یہ نہیں تھی۔ کہ مفت کام کرایا جائے۔ آپ کا وقت یقیناً ضائع ہوگا۔ اور اس کی قیمت بھی۔ خدا کی قسم آپ کو ضرور ملنی چاہیے۔ لیکن اب چھوڑیئے اس کو۔ اس کو اور کہانی سنیئے۔"

اس نے مجھے کچھ اور کہنے کی مہلت نہ دی۔ وہ بڑے صوفے پر تھا میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آصف کو میں نے کبھی کہانی سنانے یا سننے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی بوسکی کی قمیص کی آستینیں اوپر چڑھائیں۔ پتلون کے اوپر کے بٹن جو پیٹی کا کام دیتے ہیں کھولے اور صوفے پر ایک آسن جما کر کہانی سنانے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ "ہاں تو کہانی سنیئے۔ عنوان ہے 'پھول'۔ کیا خیال ہے آپ کا عنوان کے متعلق؟

میں نے کہا "اچھا ہے۔"

"مد شاہ یہ — اب آپ سنیئے — میں آپ کو منظر بہ منظر سناتا ہوں۔"

اور اس نے اپنی کہانی جو خدا معلوم کس کی لکھی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں سنانا شروع کی۔ یہ مخصوص انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ کہانی سنانے کے دوران میں وہ مداری پن کرتا ہے یعنی حسب ضرورت واقعات کے

اُتار چڑھاؤ کے ساتھ خود بھی اُترتا چڑھتا رہتا ہے۔ ابھی وہ صوفے پر ہے۔ چند لمحات کے بعد اُس کی پشت کی دیوار پر دوسرے لمحے اُس کا سر نیچے ہے اور ٹانگیں اُوپر اور دھم سے نیچے فرش پر۔ اس کے فوراً بعد کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہے مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ الیکشن میں کوئی آدمی ووٹ حاصل کرنے کے لئے تقریر کر رہا ہے۔

کہانی ختم ہوئی —— بڑی لمبی کہانی شیطان کی آنت کی طرح۔

چند لمحات خاموشی میں گذرے۔ اس کے بعد آصف نے مجھ سے پوچھا "کیا خیال ہے۔ آپ کا کہانی کے متعلق۔"

میرے منہ سے یہ الفاظ خود بخود نکل گئے "بکواس ہے!"

آصف نے زور زور سے اپنے ہونٹ کاٹے اور پھر کھلا کر صوفے کی پشت کی دیوار پر بیٹھ گیا اور غضب ناک لہجے میں پوچھا "کیا کہا؟"

کوئی اور ہوتا تو بہت ممکن ہے ڈر جاتا، مگر میں ہمیشہ ایسے معاملوں میں ثابت قدم رہا ہوں، چنانچہ میں نے اور زیادہ مضبوطی سے کہا۔ "میں نے کہا تھا بکواس ہے۔"

آصف نے اپنے مداری پن سے مجھے متاثر کرنے کی بہت کوشش کی۔ مجھے فضول کی جھک جھک پسند نہیں تھی۔ وہ بہت اُونچے سُروں میں بول رہا تھا۔ میں نے سوچا، اس کا علاج یہی ہے۔ کہ ایک دفعہ میں بھی اپنے

حلق کر کھلی چھٹی دے دوں۔ چنانچہ میں نے اُس سے کہا ”سُنیئے آصف صاحب۔ آپ ایک بہت وزنی پتھر منگوا لیجیے۔ اُس کو میرے سر پر رکھیے اور اُس پر وزنی ہتھوڑے ماریئے۔ خدا کی قسم میں پھر بھی کہوں گا۔ کہ آپ کی یہ کہانی بکواس ہے۔“

یہ سب کچھ میں نے بہت اُونچے سروں میں کہا تھا۔ آصف صوفے کی پُشت کی دیوار پر سے نیچے اُتر آیا۔ آگے بڑھ کر اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اپنے ہونٹ چُوستے ہوئے کہا ”خدا کی قسم بالکل بکواس ہے۔ میں تم سے یہی سُننے آیا تھا۔“

میں سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے۔ لیکن چند لمحات کے بعد مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ قطعاً سنجیدہ تھا۔ چنانچہ ہم کہانی میں ترمیم و اصلاح کے متعلق سوچنے لگے۔

لطیفہ ختم ہوا۔ یہ میری ذات سے یقیناً متعلق ہے مگر اس کے بیان سے مقصود صرف یہ تھا۔ کہ آپ کو آصف اور ستارہ کے کردار کا تقابل نظر آ جائے۔

ایک زمانہ گذر گیا۔ آصف اور ستارہ میاں بیوی کی زندگی گذار رہے تھے مگر یہاں مجھے ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔

جس زمانے میں آصف سے میری دوستی نہیں تھی۔ اور اُس کا تعلق بھی ستارہ کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا۔

کے آصف صاحب کے چہرے پہ بلا مبالغہ دس ہزار کیلیں تھیں اور اتنے ہی مہاسے تھے ۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے ۔کہ یہ جوانی کی نشانیاں ہیں ۔ میں سوچتا تھا ۔ اگر جوانی کی نشانیاں اتنی بد نما اور تکلیف دہ ہیں تو خدا کرے کسی پہ جوانی نہ آئے (مجھ پہ اللہ کا شکر ہے ۔ کبھی آئی ہی نہیں ۔)

میں جب اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا جو کہ بلا مبالغہ خانۂ زنبور دکھائی دیتا تھا ۔ تو مجھے بڑی کوفت ہوتی ۔ میں نیم حکیم بھی ہوں ۔ اپنی دانست کے مطابق اور اپنے ڈاکٹر دوستوں سے مشورہ کر کے میں نے کئی دوائیں خرید کر اُس کو دیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ کیلیں اُسی طرح موجود تھیں ۔ مگر جب ستارہ اُس کی زندگی میں آئی تو چند مہینوں کے اندر اندر اُس کا چہرہ بالکل صاف ہو گیا ۔ صرف نشان باقی رہ گئے تھے ۔

ایک اور لطیفہ سُن لیجئے ۔ بمبئے ٹاکیز میں کمال امروہوی اور میں دونوں اکٹھے کام کر رہے تھے ۔ اُس کی کہانی "محل" کو فلم کے لیئے موزوں و مناسب شکل دینے کے لئے سوچ بچار ہو رہی تھی ۔ اس دوران میں کمال کے داہنے گال پہ ایک چھوٹی سی پھنسی نمودار ہوئی جو اس کو بہت تکلیف دینے لگی ۔ اُس نے اس تکلیف کا ذکر مجھ سے کیا ۔ میں نے اُس سے کہا ۔" ایک بڑا سہل علاج ہے ۔ اور تیر بہدف "

اُس نے مجھ سے پوچھا " کیا ؟ "

" میں نے اُس سے کہا" تم ستارہ کا گھر جانتے ہو نا؟"

" ہاں ہاں، کیوں نہیں!"

"تو ایسا کرو۔ اُس کی سیڑھیوں کا ایک چکر لگا آؤ ___ مگر دیکھو اندر نہیں جانا۔"

کمال ذہین آدمی ہے۔ میرا مطلب سمجھ گیا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔ لطیفے ختم ہوئے۔

بہت دیر تک ستارہ اور آصف اکٹھے ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ اب دونوں غالباً ماہم کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے ___ ہاں وہیں رہتے تھے۔ کیونکہ وہاں میرا کئی مرتبہ آنا جانا ہوا۔ لیڈی جمشید جی روڈ کے چرچ کے سامنے ایک گلی تھی جس کے آخری سرے پہ ایک تین منزلہ بلڈنگ۔ غالباً تیسری منزل پر ستارہ کا فلیٹ تھا۔

مجھے یہاں جانے کا کئی بار اتفاق ہوا تھا۔ اُن دنوں آصف "پھول" بنانے کے بعد غالباً "انار کلی" بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی کہانی کمال امروہی نے لکھی تھی۔ مگر وہ شاید اُس سے مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کئی آدمیوں کو دعوت دے چکا تھا۔ کہ وہ اُس میں کچھ جدت پیدا کریں میں بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

میں عام طور پہ صبح آٹھ بجے کے قریب وہاں پہنچتا۔ دروازہ ایک

بڑھیا کھولتی۔ جو ململ کی باریک ساڑھی پہنے ہوتی۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ دروازہ الف لیلیٰ کی کسی کٹنی نے کھولا ہے۔

میں اندر جاتا اور صوفے پہ بیٹھ جاتا۔ ساتھ والے کمرے سے جو غالباً خوابگاہ تھی۔ ایسی ایسی آوازیں آتیں کہ روح لرز لرز جاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد آصف نمودار ہوتا۔ حسب عادت اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے۔ اُسکی ہیئت کذائی دیکھنے کی چیز تھی۔ ململ کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ گردن اور سینے پہ نیل پڑے ہیں۔ بال پریشان ہیں۔ سانس پھولی ہوئی ہے۔ معمولی علیک سلیک ہوتی۔ اور وہ فرش پہ ڈھیر ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ستارہ، آصف کے لئے ایک پیالہ بھیجتی۔ جس میں معلوم نہیں کس چیز کی کھیر ہوتی۔ آصف آہستہ آہستہ بادل نخواستہ پیالہ ختم کرتا، اس کے بعد ہم اپنا کام شروع کر دیتے۔ جو زیادہ تر گپوں پہ مشتمل ہوتا۔

کافی عرصہ گذر گیا۔ ستارہ اور آصف کے تعلقات بڑے مستحکم نظر آتے تھے مگر ایک دم جانے کیا ہوا کہ یہ سننے میں آیا کہ آصف اپنے عزیزوں میں کسی لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ تاریخ پکی ہو گئی۔ اور وہ عنقریب اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور روانہ ہونے والا ہے۔

میں اُن دنوں بہت مصروف تھا۔ ورنہ اُس سے ملکر ضرور دریافت

کرتا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ لیکن مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ لیکن ایک روز اُس سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔ میں نے سرسری طور پر اُس سے پوچھا تو اُس نے صرف اتنا کہا ”میں نے وہ قصہ ختم کر دینے کی ٹھانی تھی۔ چنانچہ ہو جائے گا۔“

وہ کار میں تھا۔ میں پیدل تھا۔ اور اُس کو عجلت بھی تھی۔ اس لئے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ آصف ایک بہت بڑی پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد یہ اطلاع ملی کہ لاہور میں اُس کی شادی بڑے ٹھاٹ سے ہوئی۔ رقم کے خُم لنڈھائے گئے۔ مجرے ہوئے اور راگ رنگ کی کئی محفلیں جمیں۔ پھر سُنا کہ آصف اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ بمبئی پہنچ چکا ہے۔ اور پالی ہل باندرہ میں اُس نے ایک کوٹھی کا نصف حصہ کرائے پر اُٹھا لیا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ پوری کوٹھی نذیر کے پاس تھی۔ جس نے آدھی اپنے بھانجے کو دے دی۔

یہ بڑا خوشگوار انقلاب تھا۔ مجھے معلوم نہیں ستارہ کا ردِ عمل کیا تھا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اندرہ کے ہاں وہ اکثر جایا کرتی تھی اور وہ بھی اُس کے ہاں اکثر آیا کرتا تھا۔

اُن دنوں آصف پالی ہل پر رہتا تھا۔ نئی نویلی دلہن پاس تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُن دنوں مغلِ اعظم کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس

کی کہانی کمال حیدر (مرحوم) نے لکھی تھی۔ مگر آصف اُس سے مطمئن نہیں تھا۔ اُس نے کئی انشا پردازوں سے مشورہ لیا تھا مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔

اس ضمن میں آپ کو کئی لطیفے سُنا سکتا ہوں۔ مگر اُن سے کوئی مطلب حل نہیں ہوگا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ آصف اور اس کی نئی نویلی بیوی — سنہرے جلوؤں کی بیاہی۔ چند روز اکٹھے رہے، اس کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ آصف صاحب گھر سے غائب ہیں اور راتیں ستارہ کے ساتھ گزارتے ہیں۔

یہ شادی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ نذیر کا نوجوان لڑکا بھی ذہین تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ آصف نے اپنی بیوی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ناچاقی ہوئی۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ طلاق ہونے والی ہے۔ اور اس دوران میں آصف برابر ستارہ کے یہاں جاتا تھا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ستارہ کاریگر ہے۔ اس کا مقابلہ نئی نویلی دُلہن نہیں کر سکتی۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد آصف کی دُلہن اپنے گھر واپس چلی گئی اور بعد میں معلوم ہوا کہ طلاق ہو گئی ہے۔

اب پھر آصف اور ستارہ اکٹھے تھے۔ آصف کی بیاہتا بیوی کے متعلق کئی افسانے مشہور ہیں۔ مگر میں اُن کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ مجھے اُن کی صداقت کے متعلق اچھی طرح علم نہیں۔

میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آصف نے بیاہ کیا۔ لاہور میں بڑے ٹھاٹ کی مجلسیں جمیں، اس کے بعد۔ آصف اپنی بیوی کو لے کر بمبئی آیا۔ پالی ہل پر ٹھہرا اور دو تین مہینے کے اندر اندر اُس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا —— اس کی وجہ ستارہ کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

ستارہ مردم شناس عورت ہے۔ اُس کو وہ تمام ڈھب آتے ہیں۔ جو مرد کو اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اُسے دوسری عورتوں کے لئے بالکل ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آصف نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور ستارہ کی آغوش میں چلا گیا۔ اس لئے کہ اس میں کشش تھی۔

آصف کی شادی اپنے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس خاندان کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔ لیکن میں اُن کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا۔

آصف نے اپنی بیاہتا بیوی کو چھوڑ دیا۔ شاید اس لئے کہ اُس میں وہ خصوصیتیں موجود نہیں تھیں۔ جو ستارہ میں تھیں۔ شاید اس لئے کہ آصف کنواری لڑکی کا قائل نہیں تھا۔ بہرحال جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ہر شخص کو معلوم ہے ——

آصف کی نئی نویلی دُلہن چلی گئی اور آصف نے پھر سے ستارہ کے یہاں قیام شروع کر دیا۔ اس قیام کے دوران میں عجیب و غریب افواہیں منتشر

ہو گئیں۔ مگر میں اُن کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

میں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آصف مجھ سے ناراض نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ ستارہ یقیناً ناراض ہو گی ـــــ مگر وہ مجھے تھوڑی دیر کے بعد بخش دے گی۔ اس لئے کہ اُس کا ظرف بھی چھوٹا نہیں ہے۔ وہ بڑی قدآور عورت ہے۔ (حالانکہ اُس کا قد بہت پست ہے۔) ـــــ وہ مجھے معلوم نہیں کیسا آدمی سمجھتی ہے مگر میں اُسے بحیثیت عورت کے ایسی عورت سمجھتا ہوں۔ جو سو سال میں شاید ایک مرتبہ پیدا ہوتی ہے۔

چراغ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت جنھیں میں اپنی اختصار پسندی کی وجہ سے حسرت صاحب کہتا ہوں عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ پنجابی محاورے کے مطابق دودھ دیتے ہیں مگر مینگنیاں ڈال کر۔ ویسے یہ دودھ پلانے والے جانوروں کی قبیل سے نہیں ہیں، حالانکہ کافی بڑے بڑے کان رکھتے ہیں۔

آپ سے میری پہلی ملاقات عرب ہوٹل میں ہوئی۔ جسے اگر فرانس کا "لیٹن کوارٹر" کہا جائے، تو بالکل درست ہوگا۔ ان دنوں میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا اور خود کو بزعم خویش بہت بڑا ادیب سمجھنے لگا تھا.

عرب ہوٹل میں میرا تعارف مظفر حسین شمیم نے اُن سے کرایا۔ یہ بھی

حسرت صاحب کے مفاہیم بہت ہیں کم عجیب و غریب شخصیت نہیں رکھتے۔ میں بیکار تھا۔ شمیم صاحب کی وساطت سے مجھے ہفتہ وار "پارس" میں جس کے مالک کرم چند تھے، ملازمت مل گئی۔ تنخواہ چالیس روپے ماہوار مقرر ہوئی مگر ایک مہینے میں بمشکل دس پندرہ روپے ملتے تھے۔ شمیم صاحب اور میں دونوں دوپہر کا کھانا عرب ہوٹل میں کھاتے تھے۔

ایک دن میں نے اس ہوٹل کے باہر تھڑے پر وہ ٹوکرا دیکھا۔ جس میں بچا کھچا کھانا ڈال دیا جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک کتا کھڑا تھا۔ ہڈیوں اور انڈوں کی مڑی روٹیوں کو سونگھتا، مگر کھاتا نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ سلسلہ کیا ہے۔

شمیم صاحب نے جب حسرت صاحب سے میرا تعارف کرایا اور ادھر ادھر کی چند باتیں ہوئیں، تو میرے استفسار پہ بتایا کہ اس کتے کی محبت ایک سانڈ سے ہے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان دو حیوانوں میں دوستی تھی۔ سانڈ ساڑھے بارہ بجے دوپہر کو خراماں خراماں آتا۔ کتا دم ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرتا اور وہ ٹوکرا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے حوالے کر دیتا۔ جب وہ اپنا پیٹ بھر لیتا، تو جو کچھ باقی بچ جاتا اس پہ قناعت کرتا۔

اس دن سے اب تک میری اور حسرت صاحب کی دوستی، اس

سانڈ اور کتے کی دوستی ہے۔ معلوم نہیں حسرت صاحب سانڈ ہیں اور میں کتا؟۔ مگر ایک بات ہے کہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی سانڈ اور کتا ضرور ہے۔ لیکن ہم میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو ان دو حیوانوں میں شاید نہ ہوتی ہوں۔

حسرت صاحب بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ میں ان سے عمر میں کافی چھوٹا ہوں۔ لیکن میں انھیں بڑی بڑی مونچھوں والا بچہ سمجھتا ہوں ـــــ یہ مونچھیں صلاح الدین احمد صاحب کی مونچھوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔

حسرت صاحب کہنے کو تو کشمیری ہیں۔ مگر اپنے رنگ اور خد و خال کے اعتبار سے معلوم نہیں کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فربہ اندام اور خاصے کالے ہیں۔ معلوم نہیں کس اعتبار سے کشمیری ہونے کا دعوے کرتے ہیں؟

ویسے مجھے اتنا معلوم ہے کہ آپ آغا حشر کاشمیری کے ہم جلیس تھے علامہ اقبال سے بھی شرفِ ملاقات حاصل تھا۔ جو کشمیری تھے۔ خاکسار بھی ہے۔ جس سے ان کی "سانڈ اور کتے" کی دوستی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اگر یہ ثابت کرنا چاہیں کہ خالص کشمیری ہیں۔ تو کوئی کشمیری نہیں مانے گا۔ حالانکہ انھوں نے کشمیر پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

یہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں عام طور پر بڑا بر خود غلط انسان متصور کیا جاتا ہوں۔ لیکن مجھے ماننا پڑتا ہے ـــــ اور آپ سب کے سامنے کہ حسرت صاحب بڑی دلفریب اندازِ تحریر کے مختار اور مالک ہیں۔ بڑی سہل ممتنع قسم کے فقرے اور جملے لکھتے ہیں۔ پر ان کی ان پیاری تحریروں میں مجھے ایک بات کھٹکتی ہے کہ وہ ہمیشہ اُستادوں کا طریقۂ تعلیم استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے بے شمار شاگرد موجود ہیں جو شاید ان کے علم میں نہ ہوں۔ مگر ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر بچے، نوجوان اور بڑے بوڑھے پر رعب جمائیں۔ اور اس کا مدعا تھپکا کر اُسے یہ محسوس کرنے پر مجبور کریں کہ وہ ان کا برخوردار ہے ـــــ مجھے ان کی طبیعت کا یہ رُخ سخت ناپسند ہے۔ اسی وجہ سے میری اور ان کی لڑائی ہوتی رہی ہے۔

مجھے ان کا برخوردار ہونے میں کوئی عذر نہیں۔ میں آپ سب کے سامنے یہ اعتراف کرنے کے لئے تیار ہوں کہ میں صرف برخوردار ہی نہیں، برخور سوار بھی ہوں۔ لیکن وہ مجھ پر رعب نہ ڈالا کریں۔ میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ جب سے "زمانۂ وقت" میں ان کے "حرف و حکایت" کا کالم چھپنا بند ہوا ہے۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھے صبح کی چائے نہیں ملی، جو میرے لئے بہت ضروری ہے۔

"حرف و حکایت" کا کالم میرا خیال ہے، انھوں نے "امروز" میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس روزنامے کی تخلیق و تولید میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ فیض صاحب (جو ان دنوں راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں نظربند تھے) اور حسرت دونوں مل کر گھنٹوں اس نئے پرچے کی تشکیل کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ حسرت صاحب کہنہ مشق صحافی تھے اور فیض ان کے مقابلے میں طفلِ مکتب۔ بہرحال ان دونوں نے مل کر ایک ایسے روزنامے کا نمونہ تیار کیا، جو دوسرے پرچوں نے نقل کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے "امروز" کا ہفتہ وار علمی و ادبی ایڈیشن بھی مرتب کرنا شروع کیا۔ جس میں پہلی مرتبہ ملک کے تمام اہلِ قلم حضرات نے اپنی نگارشات طباعت کے لئے دیں۔

"امروز" میں اب حسرت صاحب نہیں ہیں۔ اس کا ناک نقشہ وہی ہے، جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، مگر افسوس ہے کہ اس کو یہ حسرت ہے کہ اس میں حسرت نہیں ہے۔ "حرف و حکایت" کا کالم جو ان کی واحد ملکیت تھا۔ اب اس پر ایک صاحب کی جن کا قلمی نام "پنج دریا" ہے، اجارہ داری ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جو "سندباد جہازی" لکھ سکتا ہے، جو سلیقہ اور قرینہ اسے نصیب ہے، وہ پنج دریا کے فلک کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔

مجھے قطعی طور پر معلوم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ روزناموں میں

(اچھوسا پنجاب میں) مزاحیہ اور فکاہیہ کالم مولانا ظفر علی خان نے شروع کیا تھا، جو بعد میں مولانا چراغ حسن حسرت کی ہلکی پھلکی اور شگفتہ ظرافت کی ملکیت بن گیا۔

عبدالمجید سالک صاحب کو حسرت صاحب کے مقابلے میں فکاہی کالموں کے سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے لیکن ان دونوں میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ سالک ٹھیٹ امریکیوں کے مانند پھکڑ باز ہیں۔ حسرت انگریزوں کی طرح کھل کر ہنسنے ہنسانے والے نہیں۔ مجھے سالک زیادہ پسند ہیں۔ اس لئے کہ پنجابی ہونے کی حیثیت سے میں خود بہت بڑا پھکڑ باز ہوں۔

حسرت صاحب تحریر و تقریر کے معاملے میں بڑے محتاط ہیں۔ ہمیشہ زبان کی اُلجھنوں میں گرفتار رہیں گے۔ اس کی باریکیوں کے متعلق غور و فکر کریں گے لیکن ان کی تحریروں میں مجہول اور تابع مجہول کی تکرار مجھے ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے۔ معلوم نہیں وہ کس مجہول کے تابع ہیں؟

حسرت صاحب نے چند کتابیں لکھی ہیں جن کا اُردو ادب میں کوئی مقام نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اس طرف رجوع ہی نہیں کیا۔ ان کی ساری عمر کاروباری زندگی میں گزری ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ ان کی بے شمار تصنیفات ہیں، جو ان کے نام سے

شائع نہیں ہوئیں۔ انھوں نے اسکولوں کے لئے کئی نصاب لکھے ہوں گے جن پر بحیثیت مصنف کے کسی پبلشر کا نام درج ہوگا۔

مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ انھوں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا کہ اُردو ادب کو ان سے کتنی توقعات ہیں۔ وہ روپیہ وصول کرتے ہیں اور ادب کو جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔ ورنہ، جیسا کہ مجھے قطعی احساس ہے اگر وہ محض کالم نویسی نہ کریں، زیادہ گپ بازی اور اپنے سے چھوٹے ادیبوں کو اپنی خداداد قابلیت سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں تو وہ سعادت حسن منٹو سے چار قدم آگے ہوتے۔

میرے اس مضمون کا عنوان "شیر دارم شکرک" ہونا۔ اس لئے کہ چراغ حسن حسرت کا ہم وزن ہے۔ ان کا دودھ ان کی تحریر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت میٹھا ہوتا ہے۔ اپنے متعلق میں بیان کر چکا ہوں کہ وہ مجھے یہ دودھ مینگنیاں ڈال کر دیتے رہتے ہیں۔

آج سے غالباً بیس برس پہلے کا ذکر ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں میں نے "ہمایوں" اور "عالمگیر" کے روسی ادب نمبر مرتب کئے تھے۔ حسرت صاحب نے جو غالباً "زمیندار" یا "احسان" میں ملازم تھے، اپنے فکاہی کالم میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا، "منٹو آج کل کھٹ بنوں کی طرح صدا لگاتا پھرتا ہے کہ روسی نمبر

نکلوا لو، یا فرانسیسی نمبر نکلوا لو ـــــ دوسرے الفاظ میں یہ کمسٹ بنوں کی مخصوص صدا تھی ـــــ منجی پہبڑھی مٹکا لو"

یہ پڑھ کر میں نے لطف اُٹھایا، مگر کباب بھی ہوا۔ بہر حال جب تک حسرت صاحب زندہ ہیں (اور میری دعا ہے کہ کم از کم میری حیات تک زندہ رہیں) میں لطف اُٹھاتا رہوں گا اور کباب بھی ہوتا رہوں گا۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے شاعری سے کوئی شغف نہیں، لیکن مجھے حسرت صاحب کے ایک دُور دراز کے رشتے دار غنی کاشمیری کا ایک شعر یاد آگیا ہے۔ ؎

کدام سوختہ جاں دست زد بداماں
کہ از لباسِ تو بوئے کباب می آید

میرا خیال ہے کہ یہ حسرت صاحب ہی کی سوختہ جاں ہے۔ جس نے ہوٹل میں کباب کھاتے ہوئے میرے دامن پہ ہاتھ رکھ دیا کہ اب کباب ہونا میرے لئے ہر روز کی بات بن گئی ہے۔

غنی کاشمیری کا ذکر آیا ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ حسرت صاحب اپنی عام گفتگو میں بڑے بڑے شعرا کے نام صرف اس غرض سے لیا کرتے ہیں کہ سُننے والے ان کے رُعب کے نیچے دب جائیں۔ ان کا ایسے موقعوں پہ ایک مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے۔ جس کی نقل میں کر سکتا

ہوں۔ گو یہ موقعہ مکمل نہیں، اس لئے کہ مجھے صرف یہ مضمون پڑھنا ہے۔

ان کا اندازِ گفتگو ویسے سارے لاہور میں مشہور ہے۔ انگوٹھے کے ساتھ والی دو انگلیوں میں سگریٹ دبا کر وہ تانگے والوں کے انداز میں زور کا کش لگائیں گے۔ اور پوچھیں گے "مولانا آپ نے قاآنی کا مطالعہ کیا ہے؟"

اور اگر آپ میری طرح کم تعلیم یافتہ ہیں اور آپ کو فارسی سے کوئی شُد بُد نہیں، تو آپ مولانا چراغ حسن حسرت کے سامنے بالکل ایک چُغد کی حیثیت میں بیٹھے ہوں گے۔ پھر وہ آپ کو اور زیادہ چغد بنانے کے لئے فردوسی، سعدی، حافظ اور غالب کا فارسی کلام سنائیں گے اور آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ خود کشی کر لیں۔

میں نے اب تک خود کشی نہیں کی، اس لئے کہ میں حسرت صاحب کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ وہ بڑی قابل شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن میں خود کو بھی کسی حد تک قابل سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں۔

حسرت صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مردم کُش ہیں، سراسر غلط ہوگا۔ لیکن ان کے کردار میں ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے۔ کہ وہ جلا کر مارتے ہیں۔ اور مار کر جلاتے ہیں۔ مجھے انھوں نے کئی مرتبہ موت کے گھاٹ اُتارا

ہے۔ اور کئی بار اپنے اعجاز سے زندہ کیا ہے۔

ہم دونوں شرابی ہیں۔ لیکن ہم میں کچھ فرق ہے۔ وہ سمجھتے ہیں یا دوسروں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کی بیگم کو ان کی شراب نوشی کا کوئی علم نہیں۔ یہاں یہ عالم ہے کہ دنیا جانتی ہے کہ میں پیتا ہوں اور اس دُنیا میں میری رفیقۂ حیات بھی شامل ہے۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناؤں۔ دہلی میں ہم دونوں آل انڈیا ریڈیو سٹیشن میں ملازم تھے۔ اور اکثر اکٹھے پیا کرتے تھے۔ ان دنوں آپ نے شادی کی تھی۔ میرے اور ان کے گھر میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا اس لئے وہ ہمارے یہاں قریب قریب ہر روز آتے جاتے تھے۔ میری بیوی جانتی تھی کہ میں پیتا ہوں، لیکن حسرت صاحب کی بیگم صاحبہ یکسر منکر تھیں کہ وہ پیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ وہ پیتے ہیں۔ اور بیچ کھیت پیتے ہیں۔ مگر وہ یہ فراڈ کرتے تھے کہ گھر میں رات کو ایک دو بجے کے قریب جاتے جب کہ سب سو رہے ہوتے۔

ایک دن میں نے شرارت کی۔ ان کی بیگم صاحبہ ہمارے گھر میں تھیں۔ میں اور حسرت صاحب "بھولا رام اینڈ سنز" کے شراب خانے میں پی رہے تھے کہ مجھے اپنی بیوی کی طرف سے ایک چٹ ملی، جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ حسرت صاحب کہاں ہیں۔ میں نے جواباً لکھ دیا کہ وہ میرے ساتھ

شراب خانے میں موجود ہیں — لیکن یہ حسرت صاحب کا کمال ہے کہ ان کی
بیگم نے میری اس تحریر پر یقین نہ کیا۔

انہی دنوں کی بات ہے، مجھے لارام کے شراب خانے میں ہم سب بیٹھے
تھے۔ فیض، دیوندر ستیارتھی، محمد حسین ریڈیو آرٹسٹ اور احمد ندیم قاسمی
صاحب بیٹھے تھے کہ میری حسرت صاحب سے بحث ہو گئی۔ وہ حسب معمول
مجھ پر رعب جمانے لگے۔ میں نے چڑ کر ان سے کہا کہ میرے نزدیک ان
کی حیثیت صرف ایک لغت کی سی ہے۔ جس کے اوراق پلٹ کر آدمی
کسی لفظ کے معنی دیکھتا ہے اور پھر اسے طاق پر رکھ دیتا ہے۔ وہ بہت
ناراض ہوئے۔ اس لئے کہ میرا یہ جملہ ان کی شخصیت پر بہت بڑا حملہ تھا۔

اسی دوران میں مختلف غیر ملکی مصنفوں کی بات چل نکلی — مجھے
سامرسٹ ماہم پسند تھا۔ میں نے اس کا نام جب بار بار لیا تو چراغ حسن
حسرت صاحب نے پنجابی محاورے کے مطابق میرا "گھڑا بنھ دتا"۔ —
اگر ان کا یہ کالم میرے پاس موجود ہوتا، تو میں یقیناً آپ کی خدمت میں
پیش کر دیتا۔ اسے پڑھ کر میں بہت کباب ہوا تھا۔

دیوان سنگھ مفتون کا یہ کہنا ہے کہ اگر میں کسی کے خلاف کچھ لکھوں
اور وہ اسے پڑھ کر رات کو آرام و اطمینان سے سو جائے۔ تو اس کا یہ
مطلب ہے کہ مجھے بہت بڑی شکست ہوئی ہے۔ حسرت صاحب کو

میرے معاملے میں کبھی شکست نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ان کی تحریروں نے

جو مجھ سے متعلق ہیں، ہمیشہ مجھ پر راتوں کی نیند حرام کی ہے ۔۔۔

خدا انہیں زندہ رکھے، تاکہ میں غالب کے اس مصرعہ کا مطلب اچھی

طرح سمجھ سکوں کہ ۔

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اختر شیرانی، حسرت صاحب کے دوست تھے ۔ وہ کثرتِ شراب نوشی

کے باعث مر گئے۔ باری صاحب تھے (جو خود کو انقلابی ادیب کہتے تھے)

ان کو معلوم نہیں، شراب نوشی کی کثرت سے یا قلت سے دل کا عارضہ ہوا

اور اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ جو معلوم نہیں پانی بھی پیتا ہے یا کہ نہیں۔ میں

شدید طور پر بیمار رہا اور تین مہینے میو ہسپتال میں رہ کر بھی جانبر رہا ۔

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز تھا ساقی

لیکن ڈاکٹر پیرزادہ صاحب کچھ اور علاج کرتے رہے ۔ بہر حال میں بچ

گیا ۔ حسرت صاحب کے معالج بھی غالباً پیرزادہ صاحب تھے۔ علاج ان

کا وہی آبِ نشاط انگیز تھا مگر وہ شاعر اور ادیب نہیں۔ محض ڈاکٹر ہیں

اس لئے انھوں نے ان کو موت کے منہ سے بچا لیا، جو بہت غیر شاعرانہ

بات ہے ۔

حسرت صاحب میو ہسپتال میں دو ڈھائی مہینے رہ چکے ہیں۔ ان کو

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُن کو "کورونری تھرمبوسس" کا عارضہ لاحق تھا۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوا، تو پیرزادہ صاحب نے بھی تشخیص کی تھی کہ مجھے "سورائس لور" کی شکایت ہے۔ بہرحال ہم دونوں ایک ہی "خانہ خراب" چیز کے شکار ہیں۔

سردیوں کی بات ہے، جب وہ میو ہسپتال میں تھے۔ مجھے وہاں سے نکلے ہوئے قریب قریب تین مہینے گذر چکے تھے۔ جب میں نے ایک روز "نوائے وقت" میں پڑھا کہ مولانا دل کے مرض میں گرفتار ہیں، تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ جہاں تک دل کی رعایت سے محبت کا تعلق ہے۔ وہ کبھی گرفتار نہیں ہو سکتے۔ (ہو سکتا ہے، ان کے متعلق میرا نظریہ غلط ہو)۔

جب وہ ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں تو اس سے پندرہ بیس روز پیشتر میری ان کی ملاقات ہوئی۔ غالباً "ادارہ فروغِ اُردو" میں، اس سے چند روز پہلے میں نے تھوڑی پینا شروع کر دی تھی۔ اور وہ بھی ڈر ڈر کے۔ مولانا ملے۔ ان سے ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں ہم میو ہسپتال کے پاس پہنچے، تو میں نے ان سے عرض کیا "بوندا باندی ہو رہی ہے۔ آج کوئی پروگرام ہونا چاہیے۔"

انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔ میری صحت کے پیشِ نظر ایک لمبا چوڑا لکچر دیا، لیکن آخر کار میرے ساتھ پینے پر رضامند ہو گئے اور نتیجہ

اس کا یہ ہوا کہ وہ میو ہسپتال میں داخل ہوئے اور دو ڈھائی مہینے تک وہاں مقیم رہے۔

میں ان کا بہت عقیدت مند ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے تہیہ کیا کہ ان کے پاس جاؤں گا، لیکن رستے میں ایک نرس مل گئی، اس سے بات چیت ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے سمجھ لیا کہ میرے منہ سے "آئیڈ دفارم" کی بو نہیں آ رہی۔ اس لئے میں وہاں سے بھاگ گیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر میو ہسپتال کا رُخ نہ کیا۔

حسرت صاحب بفضلِ خدا اب تندرست ہیں۔ میں تو میو ہسپتال کے جنرل وارڈ میں رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس دولت ابھی تک موجود ہے، جو شاید انھوں نے اپنی "میجری" کے زمانے میں کمائی ہو گی۔ اس لئے کہ وہ "فیملی وارڈ" میں رہے۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ پینا چھوڑتے ہیں یا نہیں۔

یہ مضمون نامکمل ہے، اس لئے کہ میں نے افراتفری میں لکھا ہے۔

اس مضمون کا پہلا حصّہ جو آپ نے پڑھا ہے، میں نے بڑی رواداری میں لکھا تھا۔ میں نے صبح اخباروں میں دیکھا کہ حسرتؔ صاحب کے صوت یاب ہونے کی خوشی میں اُردو ادب کے اور مولانا کے دوست وائی۔ ایم۔ سی۔ اے

میں ایک جلسہ کر رہے ہیں۔ حسرت صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا عزیز سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ ان کے بارے میں جو میرے احساسات ہیں، قلم بند کروں اور اس جلسے میں حاضرین کو پڑھ کے سناؤں۔

چنانچہ میں نے قلم اٹھانے سے پہلے، محمود نظامی صاحب (ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان لاہور) کو ٹیلی فون کیا اور ان سے دریافت کیا کہ اگر میں حسرت صاحب کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں، تو کیا مجھے اسکی اجازت ہو گی۔ انھوں نے حسبِ معمول اپنی فارغ البالی سے کام لیتے ہوئے کہا تمھیں کون روک سکتا ہے۔ آؤ اور پڑھو۔

مصیبت یہ تھی کہ مجھے اسی دن لاہور ریڈیو اسٹیشن سے سات بجے اپنا تازہ افسانہ براڈکاسٹ کرنا تھا اور حسرت صاحب کی صحت یابی سے متعلق جلسہ ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا۔ میں نے عشرت رحمانی صاحب (اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر) سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ازراہِ عنایت فرمایا کہ تم کچھ فکر نہ کرو۔ یہاں افسانہ پڑھو۔ باہر موٹر کھڑی ہے وہ تمھیں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے پہنچا دے گی۔

اسی دن ایک اور مصیبت مجھ پر یہ آئی، کہ افراتفری کے عالم میں جب میں نے حسرت صاحب کے متعلق اپنے چند احساسات کاغذ پر

گھسیٹے، تو ساڑھے تین کے قریب کامریڈ سبطِ حسن تشریف لے آئے
آپ نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ میں اگر بیٹھا رہا، تو ضرورت سے
زیادہ پینا شروع کر دوں گا، مجھ سے اپنے بڑے پیارے انداز میں
فرمایا کہ میں ان کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار میٹنگ
میں چلوں۔

میں نے اپنی بیوی کو ساتھ لیا کہ آج کل وہ مجھے کہیں اکیلا نہیں
چھوڑنا چاہتی۔ ہم تقی بلڈنگ کے ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں
سوویٹ کلچر ایسوسی ایشن کا دفتر ہے۔ بڑا تیسرے درجے کا ——— خیر یہ
جملۂ معترضہ تھا، میں نے حسبِ عادت یہ زیادتی کی کہ سبطِ حسن صاحب
کو صدارت کے لئے تجویز کیا، پھر ان پر زور دیا کہ جو خط انھوں نے میری
درخواست پر میرے نام لکھا تھا، پڑھیں۔ اس کے بعد برادرم احمد ندیم قاسمی
سے بھی یہی سلوک کیا۔ چنانچہ انھوں نے بادل ناخواستہ وہ مضمون پڑھ
کے سنایا جو انھوں نے میرے بارے میں " دو شخصیتیں " کے عنوان سے
تحریر فرمایا تھا۔ اس کے بعد سب سے بڑی زیادتی میں نے یہ کی کہ
حسرت صاحب کے متعلق اپنے تاثرات حاضرین کو جن کی تعداد تیس چالیس
سے زیادہ نہیں تھی سنا دیا۔ اور یہ میٹنگ اس لئے پھسپھسی رہی کہ اس
میں صرف میرا نام گونجتا رہا۔ حالانکہ مجھے اس بات کا زعم ہے کہ جہاں میرا

نام لیا جاتا ہے، وہاں اور کچھ نہیں تو ایک آدھ ہنگامہ برپا ہونے کے آثار ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔

لیکن مجھے اپنے اس نظم کے بارے میں زیادہ دیر تک مایوسی نہ ہوئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ سے فارغ ہو کر ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ میری بیوی اور شاد امرتسری دونوں مجھے مناسب و موزوں ہدایات دینے کے لئے "کمرہ نشر" میں موجود تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ میری گاڑی پٹڑی سے اتر گئی اور افسانے کا ایک پورا پیرا براڈکاسٹ ہونے سے رہ گیا۔

حسرت صاحب پر میں نے جو مضمون لکھا تھا، وہ شاید سلیم شاہد صاحب کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اسے سنسر کر لیں۔ اور عبداللہ بٹ صاحب کو بھی دکھا لیں۔ میری تحریروں پر اکثر لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بدمزگی پیدا ہو ——— لیکن ہوئی اور ایک مخنے ہنگامے کا باعث بنی۔

ریڈیو اسٹیشن سے میں سیدھا وائی، ایم، سی، اے پہنچا۔ ہال میں سوڈیڑھ سو آدمی تھے۔ ہم پچھلے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے فوراً عبداللہ بٹ سے پوچھا کہ آیا مجھے اپنا مضمون پڑھنے کی اجازت ملے گی۔ انھوں نے فرمایا کہ ریڈیو آرٹسٹ، حسرت صاحب کی غزل گانے سے فارغ

ہو جائے، تو تمہاری باری ہوئے گی مضمون میرے پاس نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ صاحبِ صدر، میر قیوم ایم۔ ایل۔ اے کی تحویل میں ہے۔

گانے کے آخری بول ختم ہوئے تو میں ڈائس پر پہنچا۔ صاحبِ صدر نے مضمون میرے حوالے کیا۔ میں نے ایک نظر حسرت صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں دیسی کی دیسی تھیں، مگر بے حد لاغر تھے پھولوں کے ہاروں سے لدے پھندے ایک ایسے بوڑھے دولہا دکھائی دے رہے تھے جنھیں پانچویں چھٹی شادی کرنے کا شوق چرایا ہو۔

اردو صحافت سے حسرت صاحب کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ وہ خدانخواستہ مر بھی جائیں، تو مزاح نگاری ساری عمر عدت میں گذار دے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے اپنا یہ جلوس نکالنے یا اپنا جلسہ کرانے کا تکلّف کیوں کیا۔ وہ اس سے بالاتر ہیں۔

بہر حال میں نے دل ہی دل میں اس بات کا افسوس کرتے ہوئے کہ میں ان کی شدید علالت کے دوران میں عیادت کے لئے نہ گیا، اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔

حسرت صاحب اپنے موڈ میں نہیں تھے۔ شاید تعریفوں کی بھرمار اور پھولوں کے بوجھ سے ان کی طبیعت مکدّر ہو چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس سعادت مند کے احساسات کو بھی جو کافی بے تکلف تھے

گوارا نہ کیا، جب میں ایک صفحہ پڑھ چکا، تو انھوں نے مجھے اور صاحب صدر کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا کہ یہ کیا بکواس ہے۔

بکواس تو میں عام کیا کرتا ہوں، لیکن جہاں تک حسرت صاحب کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق میں کبھی بکواس نہیں کر سکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے ان کے کردار و اطوار کے متعلق چند ایسی باتیں اپنے ٹھیٹ افسانوی مگر صاف گو انداز میں بیان کر دی ہیں جو ان کی طبع نازک پر بار گذری ہوں، لیکن میرے پھکڑپن کے پیش نظر اور اس محبت کو سامنے رکھتے ہوئے جو مجھے ان سے ہے۔ اور یقیناً ان کو بھی ہے، مجھے معاف کر دینا چاہیے تھا۔

جب میں نے دیکھا کہ ان کی خفگی زیادہ شدت اختیار کر گئی ہے، تو میں نے صاحب صدر سے کہا: "اگر حسرت صاحب چاہیں تو میں اپنا مضمون پڑھنا بند کر دیتا ہوں۔" مگر انھوں نے ارشاد فرمایا کہ نہیں مضمون پڑھنا جاری رکھو۔"

سخت گرمی تھی، کچھ حسرت صاحب کے مزاج کی بھی۔ میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ مضمون ختم ہوا، تو میں نے حسرت صاحب کے پاس فرش پر بیٹھ کر معذرت چاہی، لیکن اس وقت وہ درگذر کرنے، یا میرے احساسات کے خلوص کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے ـــ میں نے کہا، ہٹاؤ، یہ

شخص اگر نہیں مانتا، تو نہ مانے ـــــ اور اسٹیج سے اُتر کر مصوّرِ پاکستان جناب عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے کمالِ شفقت سے میرا انگوٹھا دبا دیا۔ اس کے بعد میں وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے روز سننے میں آیا کہ سعادت حسن منٹو کی وائی، ایم، سی، اے میں حجامت ہوتے ہوتے رہ گئی، کیونکہ حسرت صاحب کے مداحوں کو میری ہرزہ سرائی بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہاں کچھ مداح میرے بھی تھے۔ جو ہر اس شخص کی حجامت کرنے کے لئے تیار تھے، جو میری حجامت پر آمادہ ہوتا ـــــ اگر یہ دونوں باتیں درست ہیں، تو مزا آ جاتا۔ اس جلسے میں جتنے اصحاب تھے، ان کی مفت میں حجامت ہو جاتی ـــــ اور میں تو چچا غالب کا یہ شعر پڑھ کے ان تمام حجاموں کو سناتا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ~~~
ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا

عجب آرام دیا اس بے پر و بالی نے مجھے

لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مجھے ایسے موقع پر جب کسی عظیم شخصیت کی "برسی" (معلوم نہیں یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا تھا) منائی جا رہی تھی، ایسا مضمون جو تقدیس کے معیار پہ پورا نہیں اُترتا تھا، ہرگز ہرگز پڑھنا نہیں چاہیے تھا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس کے متعلق بہت کچھ کہا سنا جا سکتا ہے

— حسرت صاحب کی تقدیس کسی ولی یا پیغمبر کی تقدیس نہیں۔ ان کی شخصیت سے، ان کی صحافت نگاری اور مزاح نویسی سے کسی کو عقیدت ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح مجھے کئی لوگ محض باتیں بنانے والا سمجھتے ہیں اور افسانہ نگار نہیں مانتے، ان کو بھی چند لوگ محض ایک کالم نگار سمجھتے ہوں، مگر اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔

انسان وہی ہے، جو کچھ کہ وہ ہے، اس کا رتبہ وہی ہے، جو اس نے خود اپنے لئے قائم کیا ہے — دنیا جائے جہنم میں۔ اگر سعادت حسن منٹو حسرت صاحب کے متعلق چند باتیں ایسی کہہ دیتا ہے جو سچی ہونے کے باعث کڑوی ہیں، یا جھوٹی ہونے کی وجہ سے کسیلی، تو اس پر اتنی ناک بھوں تو نہیں چڑھانی چاہیئے کہ اپنا حلیہ ہی بگڑ جائے۔

ہر انسان کو جو ادب یا صحافت کے میدان میں آتا ہے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی کا واحد مالک نہیں ہوتا۔

میں تو خیر افسانہ نگار ہوں۔ بہت سے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے کرداروں کو فرضی نام دے کر ان کی کہانیاں لکھتا رہتا ہوں، لیکن حسرت صاحب کو جو ہر روز کالم نویسی کرنا پڑتی ہے، اس کو ان میں تمام سیاسی اور تجارتی شخصیتوں کے اصل نام لکھنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی اور چارہ ہی نہیں۔

میرے مقابلے میں وہ بہت بڑے "پگڑی اچھال" ہیں۔ اس فن میں انھیں کافی مہارت حاصل ہے لیکن ایک بات انھیں بھولنا نہیں چاہیے کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی ——— میں لوہار نہیں ہوں، سنار ضرور ہوں، مجھے حیرت ہے کہ ان کو میرا یہ "سنار پنا" کیوں پسند نہ آیا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس جلسے میں جو کہ اب میری وجہ سے کافی حد تک بدنام ہو چکا ہے۔ خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے ایک دعا پڑھی۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تمھیں مضمون کے بجائے ایک اور دعا پڑھ دینی چاہیے تھی۔

میں حسرت صاحب کی طرح فارسی اور عربی کا عالم نہیں۔ بہر حال کفائے کے علاوہ یہ جو دعا میری زبان پر آئی ہے، یہاں لکھے دیتا ہوں۔

"خداوند ——— نہ تو کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے ——— تیرا وجود ہے بھی اور نہیں بھی ہے ——— یہ کیا مصیبت ہے۔ تیری دنیا میں ہم کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ——— پانی بھی اور شراب بھی۔ تیرا ایک بندہ چراغ حسن حسرت ہے، جو صحافت کا چراغ ہے ——— اس کو پینے پلانے کی لت ہے، جس طرح مجھے ہے، ہم دونوں بڑے آدمی ہیں مطلب یہ ہے ——— لیکن مطلب بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، تو سب

باتیں جانتا ہے ــــــ پھر یہ کیا ظلم ہے کہ آئے دن تو ہمیں بیمار کر دیتا ہے

ــــــ خدا کی قسم یہ اچھی بات نہیں ــــــ میں نے تیری ہی قسم

کھائی ہے، اگر کسی اور کی کھائی ہوتی، تو تو میرا بیڑہ غرق کر دیتا۔

نماز کبھی میں نے پڑھی ہے، نہ میرے محترم دوست حسرت صاحب نے،

بہرحال ہم تیرے قائل ضرور ہیں، اس لئے کہ تو ہمیں شدید طور پہ بیماری

میں مبتلا کر کے پھر اچھا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ٹھیک نہیں۔ میں یہ

نہیں کہتا کہ تو ہمیں حیاتِ جاوداں عنایت فرما۔ میری صرف یہ درخواست

ہے کہ تو مجھے ایک سال کے اندر اندر مار دے، لیکن حسرت صاحب

کو کم از کم بیس برس اور زندہ رکھ، تاکہ وہ اس دوران میں بھی لوگوں

کو یقین دلاتے رہیں۔ کہ انھیں دختِ رز سے کوئی واسطہ نہیں۔

حسرت صاحب کو اگر تو نے بیس برس اور زندگی عطا فرما دی، تو

میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تیرا جغرافیہ لکھ دیں گے، جو تو اپنے آسمانوں

کے اسکولوں میں نصاب مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ رائلٹی

مجھے ملے۔

تو عالم الغیب ہے ــــــ میری سفارش کے متعلق تو اچھی طرح

سمجھ سکتا ہے، اس سے زیادہ میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ

شاید تو میرا اسی وقت ٹینٹوا دبا دے۔ جس کو دبانے کی حسرت، حسرت صاحب

کہ اب تنگ رہی ہے!"

یہ دُعا تو مانگ چکا۔ بد دُعا مانگتا تو وہ کچھ اس قسم کی ہوتی:۔

"اے اللہ میاں ۔۔۔ حضرت صاحب کو موسیو اسٹالن بنادے، تاکہ وہ اس اَمر کی طرح آہنی پردے کے پیچھے اپنی من مانی کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے جتنے کمیونسٹ ہیں، ان کے تابع ہیں اور ان کے گن گاتے ہیں۔

"اگر تو انھیں کامریڈ اسٹالن نہیں بناسکتا (اس لئے کہ یہ تیرے لئے بھی کسی قدر مشکل ہے، تو انھیں مرزا محمود بنادے، تاکہ وہ اپنی ایک اُمّت بنا سکیں۔ احمد نشیر (جو آج کل لوگوں کے خاکے لکھتا پھرتا ہے) ان کے سکتر ہوں، تاکہ ان سے ناراض ہونے پر وہ ایک اور خاکہ لکھ سکے۔

"یہ بھی نہیں کرسکتا، تو انھیں سعادت حسن منٹو بنادے!"

یہ بد دعا، دعا سے چھوٹی ہے، لیکن کافی جامع ہے۔

حسرت کے متعلق اور بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے، مگر ڈرتا ہے کہ وہ اور زیادہ ناراض نہ ہو جائیں، لیکن میں بھی ایک ہی حضرت ہوں۔ چلتے چلتے آپ کو ان کے متعلق ایک لطیفہ سنائے دیتا ہوں۔

بہت دنوں کی بات ہے، "آپ" امروز کے ایڈیٹر تھے۔

میں اور "نیا ادارہ" کے مالک چوہدری نذیر ان سے ملنے گئے۔ چوہدری صاحب نے ان کو کچھ رقم پیشگی کے طور پر دے رکھی تھی کہ وہ ان کو ایک کتاب لکھ کر مرحمت فرمائیں۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس کا ذکر کیا۔ حضرت صاحب کو یہ بات اس قدر ناگوار گذری کہ تمام پبلشروں کی ہشت پشت کو بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ چنانچہ حضرت صاحب کی ان "بے نقطیوں" کو ستعار لے کر (ان کی اجازت کے بغیر) ان کے حق میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس سانسوں کے اندر اندر استعمال کر دیں۔ حضرت صاحب کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی بدتمیز انسان نے ان سے ایسی بدتمیزی کی تھی۔ ان کے لئے یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ منہ سے ایک لفظ بھی باہر نکال نہ سکے۔ میں خاموش ہوا، تو ان کو فوری طور پر اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہوا کہ میں نے ان کی توہین کی ہے۔ میں اُٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ انہوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا

"مولانا ـــــ ذرا بیٹھئے"

میں ذرا کیسے بیٹھتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ گفت گو کے ہر معاملے میں ان کی لغت میری ڈکشنری پر بھاری ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا۔ حضرت صاحب، معاف فرمائیے۔ میں اب یہاں ایک

منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتا ـــــ میرا غصہ فرو ہو چکا ہے، آپ کے غصے کا پارہ چڑھ رہا ہے۔ میں گر رہا ہوں، اگر آپ کو موقع دوں کہ آپ مجھے گالیاں دے سکیں ـــــ سلام علیکم ۔"

یہ کہہ کر میں چل دیا۔ بعد میں سُنا کہ وہ رات بارہ بجے تک اندر ہی اندر کھولتے رہے۔

مجھے اس بات کا کامل احساس ہے کہ حسرت صاحب ایسے بزرگیت پسند بزرگ کے ساتھ میں نے بہت زیادتی کی، لیکن ہر انسان کو ایسے مواقع ضرور بہم پہنچانے چاہئیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اندر ہی اندر کھولے اور بس گھولتا رہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس عمل سے آدمی سنورتا ہے، نکھرتا ہے ـــــ جس طرح بھٹی چڑھا ہوا کپڑا۔

اب میں آپ کو حسرت صاحب کا ایک اور پہلو دکھاتا ہوں، جو بے حد شریف اور دوست پرور ہے ـــــ ان سے میرے تعلقات بظاہر کشیدہ ہو چکے تھے۔ مجھ پر افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے سلسلے میں مقدمہ چل رہا تھا۔ فیصلہ ہوا، تو مجسٹریٹ صاحب نے مجھے تین سو روپے جرمانہ اور تین ماہ قید با مشقت کا حکم سنایا۔ اس کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی، تو حسرت صاحب نے کمال شفقت سے مجھے ایک رقعہ لکھا۔ جس میں یہ جملہ بھی مرقوم تھا کہ مجھے آپ کی سزا پر بہت افسوس ہوا ہے۔ اگر میں

آپ کی کوئی خدمت کر سکوں، تو حاضر ہوں۔

مجھے تو سزائیں ملتی رہیں گی اور حضرت صاحب افسوس کرتے رہیں گے لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دونوں اس ملک میں جو پہلے ہندوستان تھا اور اب پاکستان، ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں اور تادمِ آخر بھگتتے رہیں گے ——— ہمارے اپنے آدمی دم بخود رہتے ہیں۔ مگر ان فرشتوں کو کیا کہیئے، جن کے کہے پہ ہم پکڑے جاتے ہیں:

پُراسرار زینا

شاہدہ جو کہ محسن عبداللہ کی فرماں بردار بیوی تھی اور اپنے گھر میں
خوش تھی۔ اس لئے کہ علی گڑھ میں میاں بیوی کی محبت مشہور تھی اور یہ محبت
ان دونوں کے دلوں میں ایک عرصے تک برقرار رہی۔

شاہدہ اس قسم کی لڑکی تھی جو اپنے خاوند کے سوا اور کسی مرد کی طرف
نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ لیکن محسن عبداللہ ایسا نوجوان تھا جو مختلف میوے
چکھنے کا عادی تھا۔ شاہدہ کو اس کی اس عادت کا علم نہیں تھا۔ ویسے وہ
جانتی تھی کہ اس کے خاوند کی بہنیں بڑی آزاد خیال ہیں، مردوں سے
بڑی بے باکی سے ملتی ہیں۔ ان سے جنسیات کے بارے میں گفتگو کرنے
سے بھی نہیں جھجکتیں۔ مگر اسے ان کے یہ انداز پسند نہیں تھے۔

محسن کی ایک بہن ڈاکٹر رشید جہاں اس نے تو ایسے پر پرزے نکالے تھے کہ حد ہی کر دی تھی ——— میں ان دنوں ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھتا تھا۔ اس میں ایک نئے پروفیسر صاحبزادہ محمود الظفر آئے۔ یہ ڈاکٹر رشید جہاں کے خاوند تھے۔

میں بہت پیچھے چلا گیا ہوں۔ لیکن واقعات کیونکہ اچانک میرے دماغ میں آ رہے ہیں اس لئے میں مجبور ہوں کہ اس مضمون کا تسلسل قائم نہیں رہ سکے گا۔ بہر حال آپ پڑھیں گے تو آپ کڑیاں ملا سکیں گے۔

پروفیسر صاحبزادہ محمود الظفر بڑے خوش شکل نوجوان تھے۔ ان کے خیالات اشتراکی تھے۔ اسی کالج میں فیض احمد فیض صاحب جو بڑے افیمی قسم کے آدمی تھے پڑھایا کرتے تھے۔ ان سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔

ایک ہفتے کی شام کو انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ڈیرہ دون جا رہے ہیں۔ چند چیزیں انہوں نے مجھے بتائیں کہ میں خرید کر لے آؤں میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد ہر ہفتے اُن کے حکم کی تعمیل کرنا میرا معمول ہو گیا۔

وہ دراصل ڈیرہ دون میں ڈاکٹر رشید جہاں سے ملنے جاتے

سکے۔ اُن سے غالباً ان کو عشق کی قسم کا کوئی لگاؤ تھا۔ معلوم نہیں اس لگاؤ کا کیا حشر ہوا۔ مگر فیض صاحب نے ان دنوں اپنی افیمگی کے باوجود بڑی خوبصورت غزلیں لکھیں۔

یہ تمام عفنی مناظر ہیں۔ محسن عبداللہ کو کسی دوست کی وساطت سے بمبئی ٹاکیز میں ملازمت مل گئی۔ اُن دنوں یہ فلمی ادارہ بڑا وقار رکھتا تھا۔ اس کے روح رواں ہمانسو رائے تھے۔ وہ تعلیم اور اچھی فضا کے بہت قائل تھے۔ ان کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کو اپنے اسٹوڈیو میں جگہ دیں۔

محسن عبداللہ کو لیبارٹری میں جگہ مل گئی۔ ہمانسو رائے آنجہانی کے احکام کے مطابق اسٹوڈیو کے کسی اعلیٰ اور متوسط کارکن کو "طلاڈ" زجہلی کہ یہ نگار خانہ تھا) سے دور رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ قریب قریب سب اسٹوڈیو کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ محسن عبداللہ اپنی بیوی شاہدہ کے ساتھ قریب ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی کوٹھی میں مقیم تھا۔

محسن لیبارٹری میں بڑی توجہ سے کام کرتا تھا۔ ہمانسو رائے اس سے بہت خوش تھے۔ اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی جتنی اشوک کمار کی تھی جب وہ اس لیبارٹری میں ملازم ہوا تھا۔ مگر وہ اب کامیاب ایکٹر بن رہا تھا۔ اُن دنوں آزوری اور ممتاز بھی دیں تھے۔ مسٹر مکرجی جو

اس وقت مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے اسسٹنٹ تھے۔ سب خوش باش آدمی تھے۔

ہر سال ہولی کے موقع پر بڑا دلکش ہنگامہ برپا ہوتا سب ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے۔ اور بڑی پیاری رنگ رلیاں مچتیں۔

"پنر ملن" کی شوٹنگ شروع ہوئی تو ہمانسو رائے نے سنہیہ پربھا پردھان کو جو خاصی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اپنے اس فلم کے لئے ہیروئن منتخب کیا ان دنوں خواجہ احمد عباس وہاں پبلسٹی کا کام کرتے تھے۔ محسن اور عباس دونوں اس لڑکی پر عاشق ہو گئے جو سندھ کی رہنے والی تھی اور بمبئی میں نرسنگ کا کورس مکمل کر چکی تھی۔ محسن اور عباس دونوں چاہتے تھے کہ پربھا ان کے جذبات کی نرسنگ کرے۔ مگر وہ بڑی تیز نشتر تھی۔ وہ دونوں کو چرکے لگاتی تھی۔

یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے میں پھر کسی وقت لکھوں گا۔

محسن اس کے عشق میں کچھ ایسا مبتلا ہوا کہ اس نے بے تحاشا جوا کھیلنا شروع کر دیا۔ اسے جتنی تنخواہ ملتی سب قمار بازی کی نذر ہو جاتی۔ شاہدہ سخت پریشان تھی۔ اس کو اپنے گھر سے ہر مہینے کچھ نہ کچھ منگوانا پڑتا تھا۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا جو آئے دن بیمار رہتا اس کے علاج پر کافی خرچ کرنا پڑتا تھا۔

شاہدہ نے ایک دن اس سے بڑے شریفانہ انداز میں کہا: محسن تم میرا خیال نہیں کرتے ــــ کم از کم اپنے بچے کا تو کرو۔ وہ اس پر بہت برسا۔ اس لئے کہ اس کے سر پہ جوئے اور منہ پر بجا پر دھان کا بھوت سوار تھا۔

میں ان دنوں نانو بھائی ڈیسائی کے ہندوستان سنے ٹون اسٹوڈیو میں ملازم تھا۔ شانتا رام نے جو پربھات فلم کمپنی میں کئی شاندار فلم تیار کر چکے تھے۔ مجھے دعوت دی کہ تم پونہ آؤ۔ کئی صحافی اور افسانہ نویس وہاں جا رہے تھے۔ یہ خیر سگالی قسم کی دعوت تھی۔ مدعو کئے گئے لوگوں میں ایک صاحب ڈبلیو زیڈ احمد بھی تھے۔ جو غالباً ساوھنا بوس کی ٹیم میں کام کرتا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بنگالی کے ناول اُردو میں ترجمہ کرتا ہے۔

ہم پونہ میں دو روز رہے۔ اس دوران میں مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ وہ اپنے چہرے پر خول چڑھائے رکھتا تھا۔ اس کی ہنسی۔ اس کی گفتگو۔ اس کا ہر انداز مصنوعی سا دکھائی دیتا تھا۔ ایک اور بات جو میں نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مشہور یہودی ڈائرکٹر ارنسٹ لیوبش کی طرح ہر وقت منہ میں ایک لمبا سا سگار دبائے رکھتا تھا۔

اس کے بعد میری اور اس کی ملاقات راماشنکل ایکیڑ کے مکان پر ہوئی۔ وہ میرا دوست تھا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں ڈبلیو زیڈ۔ احمد بیٹھا راما کی محبوب شراب رم پی رہا ہے۔

اس سے علیک سلیک ہوئی، بڑی رسمی قسم کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے کھل کر بات کرنے کا عادی نہیں۔ وہ ایک کچھوا ہے جو اپنی گردن جب چاہے اپنے سخت خول کے اندر چھپا لیتا ہے۔ آپ ڈھونڈتے رہیں مگر نہ ملے۔

میں نے اس سے کہا "احمد صاحب آپ کچھ بات تو کیجئے۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا "آپ راماشنکل سے باتیں کر رہے ہیں۔ کیا یہی آپ کے لئے کافی نہیں ہیں۔"

یہ جواب سن کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی سیاستدان سے ہمکلام ہوں۔ سیاست سے مجھے سخت نفرت ہے۔

احمد سے راماشنکل کے فلیٹ پر متعدد مرتبہ ملاقات ہوئی لیکن وہ کھل کر پھر بھی نہ بولا۔ وہ کونے میں کرسی پر بیٹھا رم پیتا رہتا تھا۔ میں اور راماشنکل اپنی بکواس میں مشغول رہتے۔

قریب قریب دو سال گذر گئے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ڈبلیو زیڈ احمد

کوئی فلم کمپنی قائم کر رہے ہیں ـــــ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بنگالی کے مکالمے ترجمے کرنے والا یہ شخص کیسے فلم کمپنی بنائے گا؟

مگر اس نے بنا لی ـــ پرتہ نہیں اس کا نام شالیمار اسٹوڈیو رکھا گیا۔ اشتہار بازی فوراً شروع ہو گئی۔

میں نے یہ اشتہار دیکھے۔ ان میں خاص زور ایک ایکٹرس "بینا" پر دیا جاتا تھا۔ جس کو بار بار "پُر اسرار" کہا جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کسی ایکٹرس میں اسرار کیا ہو سکتا ہے جب کہ اسے اسکرین پہ آنا ہے، اس کے تو سارے بھید وہیں کھل جائیں گے۔

مگر دو برس تک برابر یہی پبلسٹی ہوتی رہی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ پُر اسرار "بینا" کون ہے؟ مگر کسی کو اس کے چہرے کے متعلق علم نہیں تھا۔

بابو راؤ پٹیل ایڈیٹر فلم انڈیا کے ساتھ مجھے اتفاقاً کام کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا "سالا تم جانتا نہیں ـــ کیسا ایڈیٹر ہوا پھر تم ہے۔ وہ ـــ تم محسن عبداللہ کو جانتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں نام سنا ہے ـــ کچھ کچھ ان کے متعلق جانتا ہوں۔"

"مینا، اس کی بیوی ہے ـــ اب سمجھا؟"

"میں نہیں سمجھا۔"

"اس کا نام شاہدہ ہے۔"

میں نے جب بابو راؤ سے مزید استفسار کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ شاہدہ رینو کا دیوی کی بھاوج ہے۔ میں نے اسے بمبے ٹاکیز کی فلم "بھابی" میں ہیروئن کے رول میں دیکھا تھا اور اس کی کردار نگاری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب میرے دماغ میں دو بھابیاں تھیں۔ ایک بمبے ٹاکیز کی "بھابی" دوسری شاہدہ عرف مینا۔ رینو کا دیوی کی بھابی۔

مجھے ڈبلیو۔ زیڈ احمد سے مزید ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے سوچا کہ وہ بڑا اندازہ گیر ہے۔ وہ جبیں سے ملے کرنے والا انسان ہے۔ سو وہ بہت روس کے آمروں کی طرح کئی کئی برسوں کی سکیمیں بناتا ہے اور بڑے اطمینان سے ان کے نتائج کا انتظار کرتا ہے۔

میں بڑا جلد باز ہوں۔ اس لئے فطری طور پر مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بڑبولا تھا۔ وہ نہایت کم گو۔ اس میں تصنع ہی تصنع تھا اور میں اس بناوٹ کا سخت مخالف۔ وہ باتیں کرتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کوئی مشین بول رہی ہے۔

لیکن مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ جب بھی بولتا بڑی پچی تلی

بات کہنا چاہیے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کئی زبانیں بولتا تھا۔ مرہٹی۔
گجراتی۔ اُردو۔ انگریزی اور پنجابی۔ اصل میں وہ پنجابی ہے۔ اس کے
خاندان کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ مولانا صلاح الدین احمد
(مدیر ادبی دنیا) اس کے بھائی ہیں۔ اس کے ایک بھائی ریاض احمد بھی
ہیں جو کسی اچھے سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔

یہ مضمون پڑھنے والے مشکل سے یقین کریں گے کہ مولانا صلاح الدین احمد
ڈبلیو زیڈ احمد (وحید) کے بھائی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ مجھے معلوم
نہیں یہ دو بھائی ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا کہ نہیں۔ لیکن ان دونوں
میں ایک مماثلت ضرور ہے کہ خوشامد پسند ہیں۔

بات شالیمار اسٹوڈیوز کے قیام کی ہو رہی تھی۔ لیکن میں یہاں
آپ سے ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں جو بہت ضروری ہے
کہ (احمد) (ڈبلیو زیڈ) سندھ کے مشہور وزیر اعظم غلام حسین ہدایت اللہ
کی لڑکی سے بیاہے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ان کا رشتہ وہاں کیسے ہوا۔ ان
تفصیلات کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

آج سے ایک ماہ پہلے احمد جب ہال روڈ پر اپنے بال کٹوانے آیا
تو میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اس حمام کے قریب ہی رہتا ہوں لہذا
میں اس کو زبردستی اپنے مکان میں لے آیا اور اس سے کہا میں بننا

کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس کی اجازت دیتے ہو؟"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا" میں آپ کو ایک دو روز میں بتا دوں گا۔"

کئی روز گذر گئے۔ اس کے بعد احمد سے میری ملاقات "ڈائرکٹر" کے دفتر میں ہوئی۔ میں نے پھر اس سے پوچھا کہ اب اجازت دینے میں کتنے روز چاہئیں۔ اس کے پائپ لگے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ پھیلی ہوئی۔ نیم گنجا سر ذرا جھکنے لگا۔ اور اس نے کہا" میں آج کل بہت معروف ہوں — بس ایک ہفتے کی مہلت چاہتا ہوں۔"

چودھری فضل حق صاحب (ڈائرکٹر کے مالک) اور شباب صاحب (ڈائرکٹر کے مدیر) بیٹھے تھے۔ میں نے کہا" بہت بہتر ہے۔ ایک ہفتہ گذرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔"

دو ہفتے گذر چکے مگر مجھے احمد سے اجازت نہیں ملی۔ میں نے سوچا کہ لینے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہر ایکٹر ایکٹرس لکھنے والا اور لکھنے والی عوام کی ملکیت ہوتی ہے اگر تم ان کے متعلق لکھنا چاہو تو بغیر اجازت لکھ سکتے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کر دیا۔
شالیمار اسٹوڈیو قائم ہو گیا۔ یعنی شاہدہ کا خاوند وہاں کی لیبارٹری

کا انچارج بنا دیا گیا۔ اب جو کچھ میرے علم میں ہے آپ سے بیان کرتا ہوں۔

شاہدہ کو ایکٹریس بننے کی کوئی خواہش نہیں تھی، وہ بڑی گھریلو قسم کی عورت تھی۔ اس کو کسی قسم کا ہنگامہ پسند نہیں تھا۔

اچھا اب آپ یہ بھی سن لیجئے۔ احمد جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بڑا اندازہ گیر تھا۔ اس نے روسیوں کی طرح ایک پنج سالہ سکیم بنائی اور اس کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس نے اپنے مخصوص کھچوے پن سے کام لیا۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ میں اسے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیئے کہ اس مضمون میں اس سے کوئی زیادہ اثر پیدا نہیں ہو سکے گا۔

محسن سنہیہ پرتھا پردھان کے عشق میں مصروف تھا جب مالی مشکلات پیدا ہوئیں تو اس نے اپنی بیوی شاہدہ سے کہا "تم بڑی بیک ورڈ ہو۔ میری بہنوں کی طرف دیکھو کتنی روشن خیال ہیں"

شاہدہ نے غالباً اس سے کہا "مجھے معاف کیجئے۔ میں اتنی روشن خیال نہیں ہو سکتی"

ان کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں۔ محسن چاہتا تھا کہ وہ فلم لائن میں داخل ہو جائے۔ مگر اس کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

عصمت چغتائی نے راب عصمت شاہد لطیف جو ضدی، آرزو،

اور بزدل جیسے کامیاب فلموں کی کہانی لکھ چکی ہے) میری بیوی سے کہا کہ شاہدہ علی گڑھ میں اس کی ہم جماعت رہ چکی ہے۔ بڑی اچھی عورت ہے۔ بہت سادہ لوح۔"

"میری بیوی بڑی حیران ہوئی۔ اس نے عصمت سے پوچھا۔" رائے تم نے کیسے قائم کی؟"

"میری سہیلی ہے۔ میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"تمہاری میرے متعلق کیا رائے ہے؟"

عصمت نے جواب دیا۔ "تم تو نری کھری عورت ہو۔"

"اس میں کیا عیب ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ـــــ لیکن تم شاہدہ سے بہت زیادہ مختلف ہو۔"

"کس لحاظ سے؟"

"وہ بیوقوف ہے۔ تم بیوقوف نہیں ہو۔ تم اپنے خاوند کو سنبھالنا جانتی ہو۔ اس کو اپنے خاوند کو سنبھالنا نہیں آتا۔"

"یہ تم کیسے کہتی ہو؟"

"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کے سارے گھرانے سے واقف ہوں۔ بہت سیدھی سادی سی لڑکی تھی ہم

کالج میں اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔۔۔ وہ جھینپ جھینپ جایا کرتی تھی۔"

عصمت نے میری بیوی کو بتایا کہ اسے عشق و محبت کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ کیسے محسن کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ محسن کچھ زیادہ ہی اس کے پیچھے پڑ گیا ہو گا۔ کہ وہ رضا مند ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ طبیعت کے لحاظ سے بہت نرم ہے اسے اس بات کا کوئی خیال نہیں ہوتا کہ آگے چل کر کیا ہو گا۔

محسن نے جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا شاہدہ کو مجبور کیا کہ وہ فلم ایکٹرس بن جائے۔ وہ بادل ناخواستہ رضا مند ہو گئی۔ چنانچہ اس کے ناتواں کاندھوں پر شالیمار اسٹوڈیوز تعمیر کر دیا گیا۔۔۔ اور احمد (ڈبلیو زیڈ) ایک پروڈیوسر بن گیا اور اس نے شاہدہ کو پُراسرار نینا بنا دیا۔ معلوم نہیں یہ نام احمد نے اس کے لئے تجویز کیا تھا یا اس کے شوہر محسن نے؟

احمد نے فلم بنانے سے پہلے اس پُراسرار نینا کی بڑی تشہیر کی۔ ہر پرچے میں یہ نام دیکھنے میں آتا۔ لوگوں کے دلوں میں بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا کہ یہ کون سی آفت جان ہے۔ چنانچہ اس فلم کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا۔ اس کا نام "ایک رات" تھا۔ معلوم نہیں اس کی تکمیل میں کتنی راتیں اس نے کاٹی ہوں گی بہر حال وہ بن گئی۔

اس فلم کی کہانی مشہور ناول "لس" کا چربہ تھا۔ اس میں شاہدہ (پُراسرار نینا) کو گوالن کا رول دیا گیا تھا۔ ایک شخص اس کی عصمت لوٹ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی باقاعدہ شادی ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی بھولی بھالی ہے۔ اپنے خاوند سے اپنی گزشتہ زندگی کے اس حادثے کو بیان کر دیتی ہے۔ وہ اس کو دھتکار دیتا ہے۔

احمد (ڈبلیو۔ زیڈ) اپنی پنج سالہ اسکیم کے ماتحت شاہدہ سے کچھ اس طرح مل رہا تھا۔ جس طرح مالوٹوف کسی دوسرے سفیر سے مل رہا ہے۔

شاہدہ کا خاوند محسن اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھا۔ اس کے ناکام عشق کا سلسلہ سنیہہ پربھا پردھان سے بدستور تھا۔ شاہدہ سے اس کو کوئی رگاؤ نہیں تھا۔ یہ میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب شالیمار اسٹڈیوز قائم نہیں ہوا تھا۔

اس زمانے میں (مجھے افسوس ہے کہ میں یہ مضمون غیر مسلسل لکھ رہا ہوں۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ خیالات جیسے دماغ میں آتے ہیں۔ میں قلم بند کئے جاتا ہوں) احمد جو محسن کے دوست بن گئے تھے۔ شاہدہ کو بیگم کہتا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ تعظیم کرتا جب وہ آتی تو احمد کھڑا ہوتا۔ اور اسے تسلیمات عرض کرتا۔ احمد نے یہ رویہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ محسن کی بے پروائی کا تقابل بنتا

چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا ۔۔۔ وہ بڑا دقیقہ شناس تھا کہ وہ شاہدہ کو ایک دو برس میں نہیں تو کم از کم پانچ برسوں میں ضرور حاصل کرے گا۔

اب میں آپ سے عرض کروں کہ فلمی دنیا میں اکثر و بیشتر حضرات محمد لون کے ذریعے سے کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے پیش نظر بھی غالباً یہی نسخہ تھا۔ احمد نے اس پر چھا جانے کے لئے کافی دقت صرف کیا۔ اس کے خاوند محسن عبداللہ کو ہر سمت سے خوش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ طبعاً اوباش تھا۔

شالیمار اسٹوڈیوز میں جب محسن کو لیبارٹری انچارج بنا دیا گیا اور اس کی معقول تنخواہ مقرر کر دی گئی تو اس نے اپنے شغل اور زیادہ زور شور سے جاری رکھے۔ شاہدہ یہ سب کچھ ایک گھریلو عورت کے مانند دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی گلہ شکوہ کرتی، مگر اس کے خاوند پر جو نئی آسمان تھا۔ کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کو بمبے ٹاکیز کی گھٹی گھٹی فضا سے باہر نکل کر شالیمار اسٹوڈیو میں ایک بہت بڑا میدان مل گیا تھا۔ جس میں وہ اپنے اشغال میں بڑی بے تکلفی سے مصروف رہ سکتا تھا۔

شاہدہ گو ایکٹرس بن گئی تھی۔ اسے اس گوالن کا رول ادا کرنا تھا۔ جس کی عصمت لوٹ لی گئی تھی۔ لیکن اسے اپنے شوہر سے پیار تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ فلمی دنیا سے نکل کر گھریلو دنیا میں چلی جائے۔ اسے یہ اسرار کھلانا

پسند نہیں تھا۔

لیکن جب اس کے متعلق اشتہار بازی ہوتے دو برس ہو گئے تو اس کے ننھے سے گھروندے میں جس کو دل کہتے ہیں، عجیب عجیب سی دھڑکنیں پیدا ہونے لگیں۔ جن سے وہ پہلے ناآشنا تھی۔

اس کے سامنے جو تقابل احمد نے پیش کیا۔ وہ اس کے متعلق اب سوچنے لگی۔ وہ آداب کا مجسمہ تھا۔ اس کے خلاف محسن بہت تکلیف دہ قسم کا بے ادب وہ اس سے بہت برا سلوک کرتا۔ اس کے علاوہ شاہدہ کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اسٹوڈیو میں دوسری عورتوں سے عشق لڑاتا پھرتا تھا۔

احمد نے محسن کو جس عہدے پر مقرر کیا تھا۔ وہ اسے اس کی اسکیم کے مطابق سنبھال نہ سکا۔ اس نے محسن کو کبھی ٹوکا نہیں تھا۔ کہ وہ جوا کیوں کھیلتا ہے۔ ریس میں روپیہ کیوں ہارتا ہے۔ اسٹوڈیو کی لڑکیوں سے کیوں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ بری طرح وہ ان خرابیوں میں گرفتار ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ خود ایک بہت بڑی خرابی کے درپے تھا۔

احمد کی اسکیم میں جو کچھ تھا وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن بھولی بھالی شاہدہ اسے نہ سمجھ سکی۔ وہ اپنے دل کی عجیب و غریب دھڑکنوں کو بھی نہیں سمجھتی تھی۔ میک اپ کرتی۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھتی اور شرما جاتی۔ اسے

یوں محسوس ہوتا کہ وہ گائز وردی کے ناول "ٹیس" کی گوالن ہے۔ جس کی عصمت لوٹی جانے والی ہے۔

اس نے جب فلم میں اپنا رول ادا کرنا شروع کیا تو اس کا حجاب کسی قدر دُور ہو گیا ــــ محسن اسی قدر اس سے دور ہوتا گیا۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی۔ کہ اس کے سچے مٹکے تڑخ رہے ہیں ــــ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ قیمتی مٹکے ٹوٹیں۔ لیکن احمد نے ان کی تریڑوں کو یقین دلایا کہ وہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔

تریڑیں آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگیں۔ اس لئے کہ احمد ایسے معاملوں میں بڑا ماہر کاریگر ہے۔ اس نے ان میں اپنی سیاست کا سیمنٹ بھرنا شروع کر دیا ــــ اس کے ساتھ ساتھ وہ محسن کے بھی چونا لگا رہا تھا۔

احمد بڑا اچھا معمار ہے۔ اس نے اپنا کام بہت آہستہ مگر بڑی صفائی سے کیا۔ آخر وہ محسن کی اینٹ کو اپنی عمارت سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے اس دوران میں شاہدہ کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کا شوہر ایک اوباش اور ناکارہ آدمی ہے۔ اس نے اس کو محض اس لئے اپنے کاروبار میں شریک کیا تھا کہ اس کی عادات سدھر جائیں گی۔ مگر وہ اس قابل ثابت نہیں ہوا۔

شاہدہ یہ سب باتیں سنتی رہی اور اس کو یقین سا آنے لگا کہ شاید یہ درست ہیں۔ لیبارٹری کا کام بہت سست رفتار تھا۔ خود احمد بھی چیونٹی کی چال چلنے کا عادی ہے لیکن ایک دن اس نے محسن سے بڑی نرمی سے کہا۔ "دیکھیئے، آپ سے کام نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ آپ اسے اپنے رتبے کے مطابق نہیں سمجھتے۔ میں لیبارٹری کسی اور کے حوالے کر دیتا ہوں۔ جو تنخواہ آپ کی مقرر کی گئی تھی برابر آپ کو ملتی رہے گی۔"

محسن پہلے تو سخت طیش میں آ گیا۔ لیکن اس کی یہ آگ فوراً احمد نے بجھا دی اس لئے کہ وہ بڑا اچھا فائر بریگیڈ ہے۔ چنانچہ شاہدہ کا خاوند ملازمت سے علیحدہ ہو گیا اور اسے پنشن ملنے لگی۔

میں محسن کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بیک وقت ذکی الحس اور بے حس ہے اس وقت شاید اس پر بے حسی طاری تھی کہ اس نے احمد کا یہ فیصلہ قبول کر لیا۔

اس کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کی بیوی جس سے وہ غفلت برت رہا ہے اور جس کو اس نے مجبور کیا ہے کہ وہ اس کی بہنوں کی طرح آزاد ہو۔ اس کی مانگ میں کوئی اور موٹے موٹے نیا سیندور ڈال رہا ہے۔ وہ قطعاً غافل تھا۔۔۔ اس کو دراصل اپنی بیوی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو بیتی اور پونہ کے گھوڑوں، تاش کے پتوں اور

پونے کے کانشٹوں سے شغف تھا۔

فلم بن رہا تھا۔ شاہدہ گولڈن بنی پہ اسرار دنیا کے نام سے اس میں کام کرنے میں دن رات مصروف تھی اور احمد ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس کو ایسی ڈائرکشن دے رہا تھا جو اس کے مقصد کو پورا کر سکے۔

محسن عبداللہ کافی وجیہہ مرد ہے۔ لم ترنگ۔ مضبوط جسم۔ تعلیم یافتہ مگر ضرورت سے زیادہ روشن خیال۔ اس نے شالیمار اسٹوڈیوز سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنی بیوی کی تعارت کے متعلق جس سے اس نے عشق کے ماتحت شادی کی تھی کچھ زیادہ خیال نہ کیا۔ اسے شاہدہ پر کامل اعتبار تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے اسکی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ اب آزاد تھا اور اس آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

ڈبلیو۔ زیڈ احمد بڑا وضعدار آدمی ہے۔ وہ اپنے عملے کے دوسرے آدمیوں کو اگر وقت پر تنخواہ نہ دے سکتا تو محسن کو اس کی پنشن مقررہ وقت پر ضرور ادا کر دیتا۔ یہ اس کے کیریکٹر کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ چھچھورا یا کمینہ نہیں۔ اس میں ایک اعلیٰ خاندان کے فرد کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن سوئے اتفاق سے وہ چونکہ فلمی دنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اور اس کی طبیعت سراسر سیاسی تھی۔ اس لئے اسے اس ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑا۔ اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا لیکن اس نے لاکھوں

روپے سمیٹے۔ ان کو اس نے کسی عیاشی میں تباہ نہیں کیا۔ دراصل وہ بڑا
سہل انگار اور سست رفتار ہے۔ اس کے علاوہ خوشامد پسند بھی، وہ
بڑے چھوٹے پیمانے پر ایک مغل بادشاہ ہے جو اپنے ارد گرد شاعروں۔
بھانڈوں اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کا جمگھٹا لگائے رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں شاید اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اس کے ہاں
ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی۔ جاں نثار اختر۔ کرشن چندر ایم اے اور
بھرت ویاس ملازم تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور میرا
بھانجہ مسعود پرویز بھی تھے۔ یہ سب احمد کے مکان کے ایک کمرے میں
بیٹھتے۔ کہانی کے مکالموں پر بڑی گرماگرم بحثیں ہوتیں۔ ساری رات
گذر جاتی اور کوئی فیصلہ نہ ہوتا اس لئے کہ درباری ماحول ہوتا تھا۔
کوئی بات شروع ہوئی تو جوش ملیح آبادی نے موقع محل کے مطابق شعر
سنانے شروع کر دیئے۔ واہ واہ ہو رہی ہے۔ مسعود پرویز جس کا دماغ
اس زمانے میں حاضر تھا۔ فوراً اسی زمین میں چند شعر کھود ڈالے ساغر نظامی
کو تاؤ آیا تو اس نے ایک لمبی نظم ترنم میں پڑھ دی۔ کرشن چندر الو بنا بیٹھا
رہتا یا افسانہ نگار تھا۔ اس کو شعروں سے بھلا کیا واسطہ۔

ان نشستوں میں کام بہت کم ہوتا۔ باتیں بہت زیادہ ہوتیں۔
بھرت ویاس کو یہ احساس کمتری تھا کہ وہ اردو زبان نہیں جانتا۔ اس لئے

وہ اپنی سنسکرت آمیز ہندی بگھارنا شروع کر دیتا۔

کبھی کبھی احمد جب کوئی موزوں نقرہ پڑھتے تو جوش ملیح آبادی عش عش کرتے اور کہتے "احمد صاحب آپ تو شاعر ہیں"۔ بس احمد صاحب اس وقت اپنا کام بھول جاتے اور شعر فکر کرنے لگتے۔ محفل برخاست کر دی جاتی اور وہ ساری رات غزل کی تکمیل میں مصروف رہتے اور جو میرا خیال ہے آج تک ایک بھی مکمل نہیں ہوئی۔

یہ سب لوگ احمد کے خوشلدی تھے۔ جوش ملیح آبادی کو ہر شلم تم کا آدھا ل جاتا تھا۔ شروع شروع میں شالیمار اسٹڈیو میں چند مہینوں تک باقاعدہ تنخواہیں ملتی رہیں۔ اس کے بعد بے قاعدگی شروع ہوگئی۔ عملے کے آدمی صرف اڈوانس پہ جیتے تھے۔

وہاں کی فضا عجیب و غریب تھی۔ ڈائرکٹر ایک تھا۔ مگر اس کے اسسٹنٹ دس بارہ کے قریب تھے۔ اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ اور در اسسٹنٹ۔ معلوم نہیں یہ لوگ گذارہ کیسے کرتے تھے اس لئے کہ تنخواہ تو وقت پہ ملتی ہی نہیں تھی۔

بہر حال یہ احمد کا معجزہ ہے کہ اس نے شالیمار اسٹڈیو کا بھرم کسی نہ کسی طرح قائم رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑا کائیاں انسان ہے۔ اس کو مشکل سے مشکل وقت بھی پریشان نہیں کر سکتا۔ بڑے اطمینان سے چاندی کی

ڈبیا میں سے پان نکالے گا۔ بٹوے میں سے چھالیا اور تمباکو نکال کر کلّے میں دبائے گا اور مسکرانا شروع کر دے گا۔

اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کسی پرکار سیاست داں میں ہو سکتی ہیں۔ اس نے اسی سیاست کی بدولت شالیمار اسٹوڈیو بنایا اور آہستہ آہستہ اپنا رستہ ماپ کر شاہدہ پر قبضہ کر لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو شاہدہ میں ایسی کیا کشش دکھائی دی کہ اس نے اس کے سپاٹ جسم پر ایک نگار خانہ تعمیر کر دیا۔ وہ ایسی عورت ہی نہیں تھی جو ایکٹرس بننے کے قابل ہو مگر شاید احمد کو اس وقت کوئی اور لڑکی میسر نہیں تھی یا آسانی سے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی کہ اس نے اپنے دوست محسن کی بیوی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور بعد میں وہ اس کے گھر یلو پن سے اتنا متاثر ہُوا کہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

لیکن یہ امر بھی مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے احمد کو شاہدہ سے کبھی محبت نہ ہوئی ہو۔ محض اپنے مفاد کی خاطر جب وہ اس پر لگاتار اپنی شرافت کا بوجھ ڈالتا رہا تو وہ اپنے خاوند محسن عبداللہ کو بھولتی گئی۔ مگر یہ نظریہ بھی درست نہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ طلاق ہونے تک وہ اپنے شوہر سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ میں اس کے متعلق آگے چل کر کچھ عرض کر دوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ شاہدہ، احمد کے

سائنڈ کہاں رہتی تھی۔ ٹھہریئے ——— میں بھول گیا۔ شروع شروع
میں وہ دونوں الگ الگ رہتے تھے۔ لیکن بعد میں ایک ہی کوٹھی
میں رہنے لگے۔

جانے کون سا سن تھا۔ میں فلمستان میں ملازم تھا۔ ایس مکرجی وہاں
کے پروڈکشن کنٹرولر تھے۔ انھوں نے ایک روز مجھ سے کہا کہ تم کہانی
کیوں نہیں لکھتے ہو۔ میں نے چنانچہ پانچ دن میں چار کہانیاں لکھیں۔
مکرجی صاحب نے مجھ سے کہا کہ مجھے سناؤ۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور
چاروں کہانیاں اپنے بھائی مسعود پرویز کو بھیج دیں جو شالیمار اسٹوڈیو
میں ملازم تھا۔

پہلی کہانی "کنٹرولستان" تھی۔ مجھے چھٹے روز مسعود کا تار ملا کہ
تمھاری یہ کہانی بہت پسند کی گئی ہے۔ بہتر ہے کہ تم پونہ چلے آؤ تاکہ احمد
صاحب سے جملہ معاملات طے ہو جائیں۔

میں پونہ گیا۔ اب یہ ایک لمبی حکایت ہے کہ میں وہاں کس طرح
پہنچا۔ میں نے شالیمار اسٹوڈیو میں کیا کچھ دیکھا۔ صرف ایک دلچسپ
بات بتائے دیتا ہوں کہ سب سے پہلے میں اس اسٹوڈیو کی موتری (پیشاب
خانے) میں گیا۔ کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں سے متعلقہ فضا کے اکثر و بیشتر
لات معلوم ہو جایا کرتے ہیں۔

میں جب اندر داخل ہوا تو سامنے دیوار پہ اُردو زبان میں جملہ لکھا تھا یہ "اور تو سب ٹھیک ہے پر یہاں پگار (تنخواہ) نہیں ملتی" میں بڑا بددل ہوا — میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں۔ لیکن مسعود نے مجبور کیا کہ احمد سے مل لوں۔ شام کو اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ دفتر میں —— یہ بڑا سگار سلگائے اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ایک طرف شاہدہ تھی۔ دوسری طرف جوشؔ ملیح آبادی۔

جوشؔ سے ٹھیک سلیک ہوئی۔ ان کے پاس آن کھلا رم کا ادھا تھا جو غالباً احمد نے احتراماً منگوا کر دیا تھا۔ احمد سے میں نے پنجابی میں گفتگو شروع کی لیکن فوراً مجھے احساس ہُوا کہ پاس جوشؔ اور شاہدہ بیٹھے ہیں جو یہ زبان نہیں سمجھتے اس لئے میں نے اُردو میں بات چیت شروع کر دی۔

میں نے جب اسے پربھات فلم کمپنی میں دیکھا تھا تو وہ تر و تازہ نوجوان تھا۔ پر اب اس میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لو چلنے کے باعث جھلس سا گیا ہے۔

اس نے اپنے مخصوص رسمی انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا تھا اور شاہدہ عرف پراسرار نینا سے بھی متعارف کیا تھا۔ وہ اُس وقت وہیں دفتر میں موجود تھی۔

اس کی شکل و صورت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس میں کوئی اسرار پوشیدہ ہو۔ معمولی خدوخال کی عورت تھی۔ میں نے جب اسے پہلی مرتبہ احمد کے دفتر میں دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ آبی رنگوں کی ایسی تصویر ہے جو بارش میں چھت ٹپکنے کے باعث اپنے رنگ کھو چکی ہے۔

اس میں ایکٹرسوں کی ایکٹرسیت نہیں تھی۔ خاموش ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کون ہوں۔ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ میں اس کے شوہر محسن عبداللہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

تھوڑی دیر جوش ملیح آبادی سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اپنا شام کا کوٹا۔ یعنی رم کا ادھا پانچ میں تھامے بیٹھے تھے اور احمد مشہور جرمن فلم ڈائرکٹر کی نقل اتار رہا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ایک لمبا سگار ہونٹوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

میں وہاں اپنی ایک کہانی بیچنے کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس کے متعلق اس دن کوئی بات نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ میں نے پری امراؤ نینا کو دیکھ لیا تھا۔

فلمستان میں ہم میں نے محسن عبداللہ کو بھی ملازم رکھوایا تھا۔ اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ ایک دن میں نے پروڈکشن کنٹرولر مسٹر مکرجی

سے کہا کہ وہ بمبئی ٹاکیز کے زمانے میں اس کا دوست رہ چکا ہے۔ اس کو شرم آنی چاہیے کہ وہ غریب کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

مکرجی نے دوسرے روز ہی اسے بلایا۔ آپس میں دوستانہ گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد مکرجی نے دوستانہ طور پر اس سے کہا کہ وہ فلمستان میں کیوں نہیں آجاتا۔ وہ راضی ہو گیا۔ اس کی تنخواہ چار سو روپے ماہوار مقرر ہو گئی۔

محسن عبداللہ بڑا کام چور ہے۔ اس کو کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرا اس کے لئے کمائے اور وہ کھائے۔

ان دنوں "آٹھ دن" بن رہا تھا۔ جس کی کہانی میری لکھی ہوئی تھی۔ اس کا منظرنامہ میں جب لکھنے لگا، تو محسن نے مجھ پر بڑے احسان کئے۔ مجھے کئی مشورے دیئے۔ جو فلمی نقطہ نظر سے بالکل غلط تھے۔ میں نے ان کو نظر انداز کر دیا۔

اس دوران میں وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کو شاہدہ کی محبت اب بھی ستاتی ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے (جو عورت بن چکی تھی) جس کا نام وہ لیا تھا۔ اور جسے ہم نے "آٹھ دن" کی ہیروئن منتخب

کیا تھا۔ اپنا ٹانکہ ملا رہا ہے۔

شروع شروع میں وہ سیکنڈ کلاس میں سفر کیا کرتا تھا۔ برقی ٹرین میں تین درجے ہوتے ہیں تھرڈ، سیکنڈ اور فرسٹ۔ فلمستان شہر سے کافی دُور تھا۔ غالباً اکیس میل۔ یہ مسافت طے کرنے میں کم از کم پون گھنٹہ لگتا تھا۔ لیکن جب رائے بہادر چونی لال نے فلم "آٹھ دن" کے لئے ویرا کے ساتھ کنٹریکٹ کیا تو اس نے فرسٹ کلاس میں آنا جانا شروع کر دیا۔

میرا خیال ہے کہ اب اس سلسلہ خیال کو یہیں بند کر دینا چاہیے اور اصل موضوع کی طرف آنا چاہیے۔

میں احمد کے دفتر میں بیٹھا ایک ابوالہول کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پُر اسرار نینا بیٹھی تھی لیکن میرے نزدیک ان دونوں میں کوئی بڑائی "مصریت" نہیں تھی۔

یوں تو پُر اسرار نینا میرے لئے بالکل اجنبی اور نئی تھی لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کو اس کی پیدائش سے جانتا ہوں جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ وہ بڑی گھر ملو قسم کی عورت ہے یا دکھائی دیتی ہے۔

میرے دل و دماغ میں بے شمار خیالات تھے اس لئے کہ میں محسن عبداللہ

کا دوست بن گیا تھا، اس نے مجھ سے اپنی زندگی کے واقعات کچھ اس انداز میں بتائے تھے کہ میں ایک سادہ لوح ہونے کی وجہ سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ اس کی بیوی شاہدہ کو اس سے بتدریج چھینا گیا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک خاوند سے اس کی موجودگی میں بتدریج یا نا تدریج کیسے چھینا جا سکتا ہے۔

اصل میں وہ اس سے غافل تھا۔ اور سنہرہ پربھا پردھان کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو جوئے بازی کا بھی شوق تھا۔ فلش کھیلتا اور اکثر ہارتا۔

اس کو اپنی بیوی سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا کہ وہ اس کی بہنوں کی طرح آزاد نہیں ہے۔ وہ عجیب فلمی ماحول سے قطعاً آشنا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھتی تھی کہ اس کا خاوند جو فلم لیبارٹری میں کام کرتا ہے کیوں اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ فلم ایکٹرس بن جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہدہ ایک ادھ بچے روشن خیال اور بیباک خاندان کی فرد تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں حجاب بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس نے شروع شروع میں اپنے خاوند محسن عبداللہ سے یہ شکایت کی کہ وہ کیوں ایک ایکٹرس سے عشق لڑا رہا ہے۔ کیوں جوا کھیلتا ہے۔ اور بیکار روپیہ ضائع کرتا ہے۔ مگر محسن عبداللہ نے اپنی بیوی کی کوئی

بات نہ سُنی۔

ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد ان کے گھر بدستور آتا رہا۔ وہ اس کا اتنا احترام کرتا تھا کہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس احترام کے قابل نہیں۔ اس کو آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ احمد جس کے ساتھ ڈبلیو۔ زیڈ چپکا ہوا ہے کوئی ایسا مرد ہے جو محسن کے مقابلے میں اس پر زیادہ جنسی احسان کر سکتا ہے۔

محسن مس پردھان کے چکر میں پڑا تھا۔ میں آپ کو یہاں بتا دوں کہ مس پردھان بڑی قبضہ گیر قسم کی عورت ہے اور محسن جو اپنی بیوی کو قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اس کے پیشِ نظر وہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کر سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ ان کے رومان کا انجام ناکام رہا۔

معاف کیجئے گا کہ میں بہک گیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں خدا معلوم کہاں پہنچ گیا۔ ویسے آپ سے عرض یہ کرنا تھا کہ احمد کے دفتر میں جب نینا سے میری ملاقات ہوئی تو میں حسبِ معمول پئے تھا اور جب میں پئے ہوتا ہوں تو مجھے تکلف برتنا نہیں آتا۔ چنانچہ میں نے پُر اسرار نینا سے کہا کہ "آپ کا اسرار تو میں نہیں جانتا۔ اس لئے کہ وہ ڈبلیو۔ زیڈ احمد کے پاس محفوظ ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔"

یہ سُن کر ڈبلیو۔ زیڈ احمد نے میری طرف دیکھا اور یہ معذرت کر کے

کہ اسے کسی سے باہر ملنا ہے چلا گیا اور ساتھ جوہش ملیح آبادی کو بھی لے گیا۔ ایسے معاملوں میں ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کا کوئی جواب نہیں۔ وہ ہر رمز اور ہر کنایہ پہچانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پنجسالہ اسکیم کے ماتحت نینا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کو اس نے پُر اسرار بنا دیا۔ اصل میں اسرار سارا احمد کا ہے جس نے اسے ایک لوٹن کبوتری بنا کر رکھ دیا ہے جو صرف اسی کے گھر میں انڈے دیتی ہے۔

ایک انڈا اس نے محسن کے گھر میں بھی دیا تھا۔ جس کا چوزہ صحت مند نہیں تھا۔ ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کی کاریگری ہے یا آپ اسے کوئی اور نام دے دیجئے کہ وہ اب تک اسے پالتا پوستا ہے۔

میں نے احمد کے چلے جانے کے بعد نینا سے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تمہاری یاد میں اکثر آنسو بہاتا ہے۔ یہ سُن کر اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی " منٹو صاحب آپ اس شخص کو نہیں جانتے اس کا ہر آنسو انگریزی کے محاورے کے مطابق مگر مچھ کا آنسو ہوتا ہے وہ آنسو نہیں بہاتا بلکہ آنسو اس کو بہاتے ہیں۔"

یہ جملہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ بہر حال شاہدہ عرف پُر اسرار نینا کی بے اسرار سنجیدگی یہ ظاہر کئے دیتی تھی کہ جو کچھ اُس نے کہا ہے اُس میں دروغ کی

گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اُن دنوں "میرا بائی" کی تیاریاں ہو رہی تھیں اس
کے علاوہ "کرشن بھگوان" کے لئے احمد نے حسبِ دستور اپنی پنجسالہ اسکیم
کے ماتحت بھارت بھوشن کو کرشن بھگوان کا پارٹ ادا کرنے کے لئے
زیرِ معاہدہ کر رکھا تھا۔

بھارت بھوشن کو ہر روز باقاعدگی کے ساتھ مکھن اور دوسری مقوی
غذائیں کھلائی جاتی تھیں۔ کہ وہ بہت دُبلا تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ
مکھن چور بن سکے۔

بھارت بھوشن کو مکھن کھلانے کے ساتھ ساتھ احمد، شاہدہ کے
اسرار میں اضافہ کرتا گیا۔ جو اس کے پروگرام کے عین مطابق تھا۔

اب میں احمد کی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی کی طرف آتا ہوں۔ جس
کا نام صفیہ ہے۔ غلام حسین ہدایت اللہ (مرحوم) وزیرِ اعظم سندھ
کی دخترِ نیک اختر۔

ظاہر ہے کہ جب خاوند کسی دوسری عورت کے ساتھ مصروف ہوگا
تو اس کی اپنی عورت جو روشن خیال اور آزاد ہو۔ یقیناً کسی نہ کسی سے
رابطہ پیدا کرلے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مشہور کمیونسٹ لیڈر سبط حسن سے
اُس کا معاشقہ ہو گیا۔

مجھے اس رومان کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس لئے

میں نے سبطِ حسن سے یہاں لاہور میں کئی ملاقاتیں کیں۔ لیکن اُس سے کھُل کر بات نہ کر سکا۔ ہر روز یہی سوچتا کہ دوسرے روز جب وہ آئیگا یا جب میں اُس سے ملوں گا۔ تو احمد کی بیوی کے بارے میں دریافت کروں گا۔ کہ یہ سلسلہ کیسے ہوا۔ کیونکہ میں نے سُنا تھا۔ کہ صفیہ جو کافی پڑھی لکھی عورت ہے امریکہ کسی علمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے گئی اور سبطِ حسن بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

میں یہ مضمون ضرور مکمل کرتا جو کسی لحاظ سے بھی تشنہ نہ رہتا۔ لیکن اچانک حکومت کی مشینری حرکت میں آئی اور سبطِ حسن گرفتار کر لئے گئے۔ اس لئے کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔

گرفتاری سے پہلے ایک شام جب ان سے ملاقات ہوئی۔ تو وہ اپنے پائپ میں جہاں کا گرد و غبار انبار کو پی رہے تھے۔ میری یہ خواہش تھی کہ اُن سے کُرید کُرید کر احمد کی سابقہ بیوی صفیہ کے متعلق پوچھوں۔ کہ اُس سے اُن کا معاشقہ کیسے ہوا۔ اب وہ کہاں ہے سبطِ حسن تین برس جیل میں رہنے کے بعد آئے تھے۔

احمد اور سبطِ حسن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ احمد سیاسی آدمی ہے۔ سبطِ حسن اس کے برعکس جذباتی۔ اس کو پنج سالہ اسکیمیں پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ جو کام ہو "فٹافٹ" ہو ——

یوں دیکھنے میں بڑے تیکھے ہیں وہ۔ لیکن اندرونی طور پر بہت ملائم۔ گرفتاری سے چند روز پہلے، وہ میرے یہاں تشریف لائے مصیبت یہ تھی کہ میرے اور کئی ملاقاتی موجود تھے۔ اُن کی موجودگی میں سبطِ حسن سے کھل کر باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں اُن سے میں نے پوچھا:-

"سہیئے آپ اب کب جیل جائیں گے؟"

سبطِ حسن نے ایک پائپ کا کش لگایا اور مسکرا کر کہا۔

"چند دنوں میں"

اور واقعی وہ پندرہ بیس روز کے بعد جیل میں داخل کر دیئے گئے اور میرا یہ مضمون نامکمل رہ گیا۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لیکن کیا کروں، یہ موضوع ہی ایسا ہے، جو ہزار پہلو ہے۔

شاہدہ (زیبا) کے شوہر محسن عبداللہ ایک بڑی خطرناک لڑکی سنبھٔ پربھا پردھان سے عشق فرما رہے تھے۔ اُن کی بیوی پر احمد صاحب بڑے سلیقے سے اپنی اسکیم کے ماتحت آہستہ آہستہ ڈورے ڈال رہے تھے۔ ادھر اُدھر اور بہت کچھ ہو رہا تھا۔ کرشی مسز نورانی تھیں۔ اُن کے ساتھ ایک پنجابی لونڈا عشق لڑا رہا تھا۔ یہ مسز نورانی، احمد کی رشتہ دار تھیں، یا مسٹر نورانی کی ——۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ میں نے کئی مرتبہ اُس کو

اُن کے گھر میں جو فررجٹ اسٹریٹ پر تھا، دیکھا۔

وہ پنجابی لونڈا بھی عجیب و غریب تھا۔ معلوم نہیں اُسے کوئی عارضہ تھا، لیکن بظاہر وہ یہی کرتا کہ اُس کو دل کے دورے پڑتے ہیں۔

مسٹر زرانی خاموش کرسی پر سگار سلگائے بیٹھے رہتے اور اُن کی بیگم پنجابی نوجوان کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی رہتی۔ کبھی کبھی بوس و کنار بھی ہو جاتا۔ مگر مسٹر زرانی کے سگار کی راکھ ویسی کی ویسی اُس پر ثابت و سالم رہی۔

عجیب سلسلہ تھا کہ مس عبداللہ، سنیہہ پربھا پردھان کے عشق کے چکر میں تھے۔ اُن کی بیوی پر احمد اپنا سکہ جما رہے تھے۔ ادھر احمد کی بیوی صفیہ، سبطِ حسن سے رومان لڑا رہی تھی۔ اور ان کے جاننے پہچاننے والوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ جاری تھا۔

میں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو مجھے چکر آ گیا۔ کہ یہ ہو کیا رہا ہے میاں یہاں بیٹھے ہیں، اور اُن کی بیوی کسی غیر مرد سے چوما چاٹی کر رہی ہے۔ ایک شوہر اپنی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی کو چھوڑ کر کسی ایکٹرس کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے۔

میرا خیال ہے دنیا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں۔ عورتیں اور مرد

ہمیشہ ایسے ہی سلسلے کرتے آئے ہیں ۔۔۔!

ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے بے اعتنائی برتنے اور کسی اور عورت کے عشق میں گرفتار ہو جائے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ہزاروں میں صرف چند عورتیں ایسی نکلیں گی جو کسی اور مرد سے ناتا نہ جوڑیں۔ پونا میں احمد اور نینا (شاہدہ) اکٹھے رہتے تھے۔ ایک بنگلہ تھا۔ بہت اچھا۔ لیکن احمد اُس میں کبھی کبھار آتا۔ بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی کرتا اور چلا جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس نے وہاں مستقل طور پر قیام کر لیا۔ اب وہ دونوں ایک ساتھ صبح کو ناشتہ کرتے، دوپہر کو لنچ کھاتے اور رات کو ڈنر پر بھی ایک ساتھ ہوتے۔

اسٹوڈیوں میں تو خیر اُن کا ایک ایک لمحہ ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا۔ عجیب بات ہے کہ اس دوران میں احمد نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ شاہدہ کو اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے۔

شاہدہ کے خاوند محسن عبداللہ کو تو احمد اپنی حکمتِ عملی کے ذریعے سے اپنے اسٹوڈیو سے باہر نکال چکا تھا۔ جیسے مکھن سے بال۔ وہ بمبئی میں سڑکوں پر پیدل چلتا تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیوی کی وجہ سے پونہ سے بمبئی کا دن میں آیا تھا۔ پر اب اُسے کوئی لفٹ

دبنے والا نہیں تھا۔

میں ایک روز ٹیکسی پر ہیمنگٹن روڈ سے گزر رہا تھا کہ محسن مجھے نظر آیا۔ میں نے ٹیکسی رکوائی اور اُس کی خیر خیریت پوچھی۔

"سنائیے محسن صاحب۔ آپ کہاں ہوتے ہیں آج کل؟"

اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ ——— عجیب قسم کی مسکراہٹ پیدا ہوئی: "آجکل میرا کام سڑکیں ناپنا ہے"

میں نے از راہِ مذاق اُس سے پوچھا: "ہیمنگٹن روڈ کی لمبائی اور چوڑائی کتنی ہے"

اُس نے بھی میرے ہی انداز میں جواب دیا: "آپ جتنی لمبی ——— مجھ ایسی چوڑی"

میں نے اس سے کہا۔ کہ آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔ جہاں تمہیں جانا ہے وہیں چھوڑ دوں گا۔ مگر اُس نے میری یہ دعوت قبول نہ کی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت مضطرب تھا۔

اور اس اضطراب کی وجوہ کئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی بیوی کو قریب قریب کھو چکا تھا۔ سینہ پر بھاپ دھماں اس سے سخت بے اعتنائی برت رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ جوئے میں اپنی ساری جمع پونجی ہار چکا تھا اور کوئی ملازمت بھی نہیں تھی۔ جس کا آسرا ہوتا۔

میں نے اُس سے پوچھا: "سناؤ یار، مس پردھان کا کیا حال ہے؟"

اس نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا: "ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب اُس سے خواجہ احمد عباس عشق لڑا رہا ہے۔"

محسن نے مسکرا کر کہا: "دو تین مہینوں کے اندر اندر گنجا ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا: "کیوں؟"

اس نے جواب دیا: "اس عورت کو آپ نہیں جانتے۔ وہ عورت نہیں سیفٹی ریزر ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ اس کے مونڈے ہوئے بال پھر کبھی نہیں اُگتے۔" میرے جسم پہ بے شمار بال ہیں۔ میں نے سوچا اگر یہ سیفٹی ریزر میرے ہاتھ آ جائے تو میں کتنی جلدی اس لعنت سے نجات پا جاؤں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے کوشش نہ کی۔ ورنہ میرا بھی حشر وہی ہوتا جو محسن عبداللہ اور خواجہ احمد عباس کا ہوا۔ خواجہ گنجا ہو گیا اور محسن کے بال بھی جھڑنے لگے۔

مدت کے بعد جب میں فلمستان میں بحیثیت افسانہ نگار اور منظر نویس ملازم ہوا۔ تو محسن سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی حالت بہت دردناک تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مسٹر ایس مکرجی کا دوست ہے۔ اس لئے کہ وہ دونوں بمبے ٹاکیز میں ایک ساتھ کام کر چکے تھے۔ اور وہاں کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔

احمد بمبے ٹاکیز سے کبھی وابستہ نہیں رہا۔ وہ صرف سادھنا بوس کے ساتھ ایک دو برس رہا۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ اس کے کیا تعلقات

تھے۔ بہر حال وہاں سے نکل کر اُس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور
اُس کا کرتا دھرتا بن گیا۔

میں اِس سے پیشتر اِس مضمون کی پہلی قسط میں کہہ چکا ہوں کہ احمد
بہت سیانا اور ذہین آدمی ہے۔ اُس نے بڑے بڑے مارواڑیوں کو بچہ
دیا۔ کچھ ایسے طور پر کہ اُن کو خبر تک نہ ہوئی۔

رفیق غزنوی

معلوم نہیں کیوں، لیکن میں جب بھی رفیق غزنوی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے معاً محمود غزنوی کا خیال آتا ہے جس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے، جن میں سے بارہ مشہور ہیں۔ رفیق غزنوی اور محمود غزنوی میں اتنی مماثلت ضرور ہے کہ دونوں بُت شکن ہیں۔ رفیق غزنوی کے پیشِ نظر کوئی ایسا سومنات نہیں تھا جس کے بُت توڑ کر وہ اُن کے پیٹ سے زر و جواہر نکالتا، پھر بھی اس نے اپنی زندگی میں کئی طوائفوں کو (جن کی تعداد بارہ تک پہنچ سکتی ہے) استعمال کیا۔

رفیق غزنوی کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد غزنی کے رہنے والے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے غزنی دیکھا ہے یا نہیں۔

صرف اِتنا معلوم ہے کہ وہ پشاور میں رہتا تھا۔ اُس کو پشتو بولنا آتی ہے۔
افغانی فارسی بھی جانتا ہے۔ ویسے عام طور پر پنجابی میں گفتگو کرتا ہے۔
انگریزی اچھی خاصی لکھ لیتا ہے۔ اردو میں اگر مضمون نگاری کرتا تو اس
کا بڑا نام ہوتا۔

اُس کو اُردو ادب سے بڑا شغف ہے۔ اُس کے پاس اُردو
لٹریچر کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ گلشن محل (دیبیہ)
میں اُس کے کمرے میں بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو مجھے
بڑی حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ محض ایک میراثی ہے، جسے
ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب اُس سے باتیں ہوئیں تو اُس
نے ایسے ایسے مصنفوں کا نام لیا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ اُس نے
میری معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ ایک ابوالفضل صدیقی ہیں جو چرندوں
اور پرندوں کی کہانیاں لکھنے کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ میں نے اُن
کے افسانے پڑھے اور پسند کئے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مضمون جو مجھے رفیق غزنوی پر لکھنا ہے
کہاں سے شروع کروں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ شروع ہو چکا ہے اور اس
کا خاتمہ بالخیر بھی ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنے حافظے کو ٹٹول کر آپ کو بتانا
چاہتا ہوں کہ اُس سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ اُس سے جسمانی طور پر متعارف ہونے سے پہلے ہی میں اُسے جانتا تھا۔ کیسے جانتا تھا، کب سے جانتا تھا، یہ مجھے یاد نہیں۔ آج سے غالباً چوبیس پچیس برس پیچھے کی بات ہے، میں امرتسر میں بجلی والے چوک سے گذر رہا تھا کہ ایک پان والے نے مجھے آواز دی۔ میں رک کر اُس کی دکان کے پاس گیا تو اُس نے مجھ سے کہا: "بابو صاحب۔ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اب تو حساب چکا دیجئے؟"

میں بہت متحیر ہوا، اس لئے کہ اُس پان والے سے میرا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ میں نے اُس سے کہا "کیسا حساب — میں تو آج پہلی مرتبہ تمہاری دکان کے پاس ٹھہرا ہوں۔"

یہ سن کر پان والے کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "نہ دینے والے اسی طرح کہا کرتے ہیں۔"

جب میں نے اُس سے تفصیل چاہی تو پتہ چلا کہ وہ مجھے رفیق غزنوی سمجھتا تھا جو اُس سے اُدھار لیتا رہا تھا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں سعادت حسن ہوں تو اُس نے مجھ سے کہا کہ میری اور رفیق کی شکل بہت ملتی جلتی ہے۔

رفیق غزنوی کا نام تو میں بہت پہلے سن چکا تھا۔ اُس سے ملنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی، پر جب میں نے سُنا کہ اُس کی شکل میری

شکل کے مشابہ ہے تو مجھے اُس کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب میں نے آوارہ گردی شروع کر رکھی تھی طبیعت ہر وقت اچاٹ اچاٹ سی رہتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھُد بُد ہر وقت دل و دماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز بھی سامنے آئے اُسے چکھوں، خواہ وہ انتہا درجے کی کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔

تکیوں میں جاتا تھا۔ قبرستانوں میں گھومتا تھا۔ جلیاں والا باغ میں گھنٹوں کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر کسی ایسے انقلاب کے خواب دیکھتا تھا جو چشم زدن میں انگریزوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دے۔ اسکولوں کو جاتی ہوئی لڑکیوں کے جھرمٹ دیکھتا تھا اور اُن میں کوئی اچھی سی لڑکی منتخب کر کے اُس سے عشق لڑانے کے منصوبے تیار کرتا تھا۔ بم بنانے کے نسخے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڑے بڑے گویوں کے گانے سنتا تھا اور کلاسیکل موسیقی کو سمجھنے کے لئے پیچ و تاب کھاتا تھا۔

میں نے اِس زمانے میں شعر کہنے کی بھی کوشش کی۔ فرضی معشوقوں کے نام عطر لگے کاغذوں پر بڑے بڑے طویل محبت نامے بھی لکھے اور گر کچا اُس سمجھ کر پھاڑ دیئے۔ دوستوں کے ساتھ مل کر چرس کے سگرٹ پیئے۔ کوکین کھائی۔ شراب پی، مگر جی کی بے کلی دور نہ ہوئی۔

شدید آوارگی کے اِسی دَور میں مجھے رفیق غزنوی سے ملنے کی

خواہش ہوئی۔ چنانچہ میں تکیوں میں، شراب خانوں میں اور رنڈیوں کے
کوٹھوں پر جا جا کر پوچھا کہ رفیق غزنوی کہاں ہے مگر کسی نے اُس کا
ٹھور ٹھکانا نہ بتایا۔ کئی بار سننے میں آیا کہ وہ امرتسر میں آیا ہوا ہے۔ میں
نے ہر بار بڑی مستعدی سے اُس کو ڈھونڈا مگر اُس کا نشان نہ ملا۔

ایک دن پتہ چلا کہ وہ اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا
ہے۔ اُس کا یہ دوست ایک درزی تھا میں اُس کا نام بھول گیا ہوں لیکن
اُس کی بیٹھک ہمارے گھر کے پاس کرموں ڈیوڑھی کی ایک گلی میں
تھی جہاں وہ کام کرتا تھا۔ میں نے رفیق کو یہاں تلاش کیا معلوم ہوا
کہ وہ شہر کے باہر ایک غیر آباد سے علاقے میں مقیم ہے جہاں اُس
درزی کا گھر تھا۔ یہ پتہ مجھے بالے نے دیا۔ وہ بھی وہیں جا رہا تھا۔
موقع بڑا اچھا تھا چنانچہ میں اُس کے ساتھ ہو لیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں بالے کا تعارف کرا دوں۔
مجھے یہ بتلاتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ لوگ اُسے بالا کنجر کہتے تھے۔
معلوم نہیں انسانوں کے ساتھ اُن کے آباؤ اجداد کی ذات کیوں
منسوب کر دی جاتی ہے۔ بالا جیسا کہ میں جانتا ہوں نہایت خوش
ذوق نوجوان تھا۔ تعلیم یافتہ۔ خوبصورت۔ ہنسوڑ۔ بذلہ سنج شاعر مزاج۔
اُس کی طبیعت میں وہ جوہر تھا جو کسی بھی انسان کو فن کی پابندیوں پر

پہنچا سکتا ہے۔

اُس کو معلوم تھا کہ لوگ اُسے کس نام سے یاد کرتے ہیں، لیکن اُس کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ رہتا سہتا وہیں تھا جہاں عورتیں اپنا جسم بیچتی ہیں۔ اب وہ کراچی میں رہتا ہے اور اپنا فن بیچتا ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک اخبار کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مشہور مصوّر ہے جس کی تصویروں کی نمائش اہلِ نظر حضرات میں بہت مقبول ہوئی۔

بالا گاتا بھی تھا، مگر اُس کی آواز بھدّی تھی۔ کیپٹن وحید، انور پینٹر، عاشق علی فوٹو گرافر، شاعر نعیم، محسن عبداللہ، گیانی اوور سنگھ دندان ساز۔ ان سب کی ایک بوہیمیائی قسم کی ٹولی تھی۔ ان کا بیٹھنا اٹھنا زیادہ تر انور پینٹر کی، یا گیانی اوور سنگھ کی دکان میں ہوتا تھا۔ یا ان کی نشست بیچے (عزیز) کے ہوٹل شیراز اور اُس درزی کی بیٹھک میں ہوتی تھی جس کا نام میں بھول گیا ہوں۔

بھنگ گھوٹی یا گوشت میں بھونی جاتی تھی اور طبلے کی تھاپ پر راگ راگنیاں، ٹھمریاں، دادرے الاپے جاتے تھے۔ عاشق علی فوٹو گرافر کی آواز سُریلی لیکن بہت پتلی تھی۔ وہ اکثر رفیق کی بجروں میں گاتا تھا۔ کیپٹن وحید طبلہ بجاتا تھا۔ انور پینٹر صرف داد دیتا تھا۔

گیانی اروڑ سنگھ دانت الکھیڑ نابھول کہ خان صاحب عاشق علی خان (نان کپتان خان فتح علی خان کے فرزند) کی گمبھیر اور بالشت بھر چوڑی آوازمیں اکثر پہاڑی سنایا کرتا تھا اور بالا صرف لطیفے۔ کبھی کبھی اپنی تازہ غزل بھی۔ مجھے اُس کی ایک غزل کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے:۔

اشک مژگاں پہ ہے اٹک سا گیا
نوک سی چبھ گئی ہے چھالے ہیں

ہالے ہیں، شولے ہیں، اجالے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اچھی غزل تھی۔

گیانی اروڑ سنگھ کا اچھا بھلا کام چل رہا تھا۔ مگر جسے آرٹ کی چاٹ پڑ جائے، اُس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ راگ کی دنیا میں وہ ایسا کھویا کہ دندان سازی کی دکان معہ جملہ ساز و سامان کے غائب ہو گئی اور پینٹر کا بھی دیوالہ پٹ گیا۔

عاشق علی فوٹو گرافر کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ ایک دن امرتسر سے ایسا غائب ہوا کہ ابھی تک لاپتہ ہے۔ جیسے (عزیز) کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اب وہ لاہور میں مطلب کرتا ہے۔ شاعر نقیر جبین سیس صابن بنا رہا ہے۔

گیانی اروڑ سنگھ کامیاب ایکٹر بنا، مگر اب سنا ہے کہ اُس نے دنیا

تیاگ دی ہے اور خدا سے لو لگائے بیٹھا ہے۔ کیپٹن وحید نے پانچ بچوں والی ایک عورت سے شادی کر لی۔ آجکل ٹھیکیداری کرتا ہے۔

رفیق غزنوی جس رنگ میں پہلے تھا، اُسی میں ہے۔ کراچی میں ریس کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور فلموں میں موسیقی بھرتا ہے۔

بڑی مصیبت ہے، میں نے جب بھی ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا جو پُرانی یادوں کے متعلق ہوں تو ہمیشہ بہک گیا۔ اب دیکھیے میں بات رفیق غزنوی سے ملنے کی کوشش کی کر رہا تھا اور چلا گیا فروعات میں ——— لیکن سچ پوچھیے تو مجھے فروعات ہی سے محبت ہے میں زندگی کو بھی ایک فروعی چیز سمجھتا ہوں۔

ہاں جناب، تو میں بابے کے ساتھ ہو لیا۔ اپریل کی خنک رات تھی۔ تانگہ دیر تک چلتا رہا۔ آخر بابے نے ایک نیم تاریک مقام پر اُسے ٹھہرایا۔ آج سے تئیس چوبیس برس پہلے کی بات ہے، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس یک منزلہ مکان میں ہم داخل ہوئے وہ پیڑوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ مبدھا موٹا اور وہ درزی جس کا نام میں بھول گیا ہوں، اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے فلش کھیلنے اور شراب پینے میں مشغول تھے۔

مجھے مبدھے موٹے سے سخت نفرت تھی۔ اوّل تو یہ کہ وہ بہت

موٹا اور بہت طاقتور تھا اور دوسرے یہ کہ وہ زبردستی مجھے تاش کھیلنے کو کہتا اور پتے بازی کر کے مجھ پر آٹھ دس روپے کا قرض چڑھا دیتا اور دوسرے تیسرے دن مجھے کسی بازار یا گلی میں پکڑتا اور اپنا خوفناک چاقو دکھا کر اسے وصول کر لیتا۔

بالے نے درزی سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ وہ دوبرس سے غائب ہے۔ کہاں ہے یا ہو سکتا ہے اس کے متعلق اسے علم نہیں تھا۔ درزی نے کہا "بالے، تمہیں معلوم ہی ہے۔ جب وہ کسی کے پیٹے پر چڑھتا ہے، پندرہ دن کے بعد ہی نیچے آترتا ہے۔"

بالا مسکرا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو اچھی طرح معلوم ہے۔ میری یہ کوشش بھی بیکار گئی۔ غالباً ایک برس کے بعد میں نے اس کا فوٹو عاشق علی کے ڈارک روم کی ایک ڈش میں پانی پر تیرتا ہوا دیکھا۔ عاشق علی بہت اچھا فوٹوگرافر تھا۔ غالباً وہ پہلا شخص تھا جس نے فوٹوگرافی کے قدیم اصولوں کی خلاف ورزی کی۔

عام طور پر فوٹوگرافر یہ کرتے تھے کہ اپنے گاہک کو خوش کرنے کے لئے اس کے چہرے کی وہ تمام لکیریں دور کر دیتے تھے جو انسان میں اس کے کردار اور تشخص کی مظہر ہوتی ہیں۔ وہ اس کے چہرے کو چھپاتا ہوا

آلو سا بنا دیتے تھے جس پر کوئی داغ دھبہ ہو نہ کوئی سلوٹ لکیر۔ عاشق علی کہتا تھا، فوٹو گرافر کا کام یہ ہے کہ انسان کو اُس طرح پیش کرے جس طرح کہ وہ اُسے دیکھتا ہے۔ کیمرے کا کام صرف عکس لینا ہے اور بس۔

عاشق علی روشنی اور سایوں کے امتزاج کا خاص خیال رکھتا ہے۔ رفیق کی جو تصویریں میں نے دیکھیں، میرا خیال ہے وہ عاشق علی کا شاہکار تھی۔ رفیق نے عربوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اُس کا لمبوترہ چہرہ بہت پُرکشش تھا۔ سائے زیادہ تھے اور روشنیاں کم۔ خدوخال تیکھے اور نوکیلے نہیں تھے مگر جاذبِ نظر تھے۔ بڑی وجیہہ شکل و صورت تھی ناک لمبی جو پھننگ کے قریب چوڑی ہو گئی تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست۔ ان کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی نکونیں۔ بال پیچھے کی طرف کنگھی کئے ہوئے۔ لمبی قلمیں ——— مجھے اُن میں اور اپنے میں کوئی مماثلت نظر نہ آئی۔ معلوم نہیں اُس پان والے کو مجھ پر اُس کا دھوکا کیسے ہو گیا۔

عاشق علی نے مجھے بتایا کہ رفیق پرسوں آیا تھا اور اُسی روز شام کو واپس لاہور چلا گیا۔ میں لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی میں ہے ——— اب راولپنڈی کون جاتا۔ میں واپس امرتسر چلا آیا۔ آٹھویں روز پتہ چلا کہ وہ امرتسر ہی میں ایک طوائف کے مکان پر نظر بند

تھا ——— میں جھنجھلا گیا۔

کئی برس گزر گئے مگر رفیق غزنوی سے ملاقات کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔ میں یوں بھی تھک ہار کر اُس کو تلاش کرنے کی سرگرمی ترک کر چکا تھا۔ اِس دوران میں البتہ یہ معلوم ہوتا رہا کہ وہ کثرت سے گمنیاں کی قریب قریب تمام مشہور طوائفوں کو "سرفراز" کر چکا ہے۔

فیض کی اپنے مخصوص طرز میں گائی ہوئی غزلیں ہر گوشے پہ گائی جاتی تھیں۔

یہ کیا ہے جی؟ ——— رفیق کی بحر ہے۔ یہ کیا انداز ہے سرکار؟ ——— حضور رفیق غزنوی کا۔ یہ چکنا چور گھڑی رفیق صاحب کی ہے۔ کل انھوں نے تان جو لی تو زور سے ہاتھ لہرایا۔ کلائی دیوار کے ساتھ ٹکرائی اور گھڑی کے ہزار ٹکڑے۔ پرسوں رفیق غزنوی ایک رنڈی کے کوٹھے پہ گانا سنانے لگا۔ ساز سُر میں کسے گئے۔ رفیق نے طبلے والے سے کہا تم بھی کرو سُر میں اپنے طبلے۔ طبلچی نے کہا، میں کر چکا ہوں۔ رفیق نے کہا پھر دوبارہ کر دو ——— دائیں پر ابھی ابھی ایک مکھی بیٹھ گئی تھی ——— لعنت ہے اُس مکھی پہ اور لعنت ہے رفیق غزنوی پر۔

اُن دنوں یہ غزل عام طور پہ رفیق کی بحر میں گائی جاتی تھی۔ دیکھئے حافظے پہ زور دے کر اُس کا کوئی شعر یاد کرتا ہوں ——— نہیں یاد آ رہا۔ کچھ ایسا ہی تھا ——

سو رہے ہیں پاسباں یا سب ہے خوابِ ناز میں

اور خدا معلوم کیا۔

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

شاید اقبال کی کوئی غزل تھی۔ معاف کیجیے گا میرا حافظہ بہت کمزور ہے

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اے۔ آر۔ کاردار لاہور میں پنجاب کا پہلا متکلم فلم "ہیر رانجھا" بنا رہا ہے اور رفیق اس کا ہیرو ہے، یعنی رانجھا۔ ہیروئن امرتسر کی ایک طوائف انوری ہے (یہ آجکل ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل جناب احمد سلمان سابق جگل کشور مہرہ کی بیگم ہیں) قیدو کا پارٹ ایم اسمٰعیل کو دیا گیا ہے۔

فلم بن گیا مگر میں لاہور نہ جا سکا، معلوم نہیں کیوں ـــ اس دوران میں مختلف افواہیں سننے میں آتی رہیں۔ کاردار کا رفیق سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ رفیق، انوری سے رومان لڑا رہا ہے۔ انوری کی ماں سخت برہم ہے۔ ضرور ایک روز چاقو چھری چلیں گے ـــ لیکن ایک دن یہ خبر آئی کہ رفیق انوری کو بڑے ڈرامائی انداز میں لے اُڑا ہے۔

یہ خبر صحیح تھی۔ واقعی وہ انوری کو لے اُڑا تھا۔ انوری کی ماں بہت چیخی چلائی تھی۔ رفیق کے پیچھے غنڈے بھی لگائے گئے تھے، مگر اس نے

کرتی پر دانہ کی اور شربت وصال وسکی کے ساتھ ملا ملا کر پینتا رہا۔ آخر اُس نے انوری کو اُس کی ماں کے پاس امرتسر روانہ کر دیا۔ اِن فاتحانہ مگر نہایت "پُرلطف" الفاظ کے ساتھ "یہ لو سنبھال لو اپنی "سُنڈ کی پڑی" کو"۔

وہ بے چاری اب اپنی "سُنڈ کی پڑی" کو کیا سنبھال کے رکھتی جس دن کے لئے اُس نے اُسے سنبھال سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ اُس پر تو رفیق غاصبانہ قبضہ کر چکا تھا۔ کر چکا تھا کیا، کر کے فارغ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ یہ "پڑی" دوسرے لفظوں میں اپنی "گُڑی" غیر مشروط طور پر رفیق غزنوی کے حوالے کر دے۔

رفیق غزنوی کا حُسن و عشق کے سومنات پر یہ پہلا معرکہ آرا حملہ ہے۔ انوری کے بطن اور رفیق کے نطفے سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام زرینہ رکھا گیا۔ (جو نسرین کے فلمی نام سے اداکارہ ہی کے فلم "شاہ جہاں" میں ممتاز محل کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ حال ہی میں ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل جناب احمد سلمان سابق جگل کشور مہرہ کی دختر نیک اختر کی حیثیت سے اُس کا نکاح کراچی میں ایک صاحب ثروت سے ہوا ہے۔)

کئی اور برس گذر گئے ——— اِس دوران میں کن کن مراحل سے مجھے گذرنا پڑا، اس کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ اس مضمون کا موضوع۔

صرف رفیق غزنوی کی ذات ہے۔

میں بمبے پہنچ گیا۔ وہاں بہت دیر تک اخباروں میں جھک مارتا رہا۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ رفیق نے انوری کو چھوڑ دیا ہے اور اب کلکتے میں ہے جہاں وہ فلموں کے لئے موسیقی مرتب کرتا ہے۔

میں لکھنا شروع کر چکا تھا۔ ادبی حلقوں سے میرا تعارف بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے اُردو ادب سے دلچسپی لینے والے مجھے جاننے لگے تھے۔ دیر تک اخباروں میں جھک مارنے کے بعد میں فلمی دُنیا میں داخل ہوا۔ یہاں بھی ایک دو برس جھک مارنا پڑی۔ اپنے لئے کوئی مقام پیدا کرتے کرتے میں ہندوستان سنے ٹون پہنچ گیا جس کے مالک سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی تھے۔ آپ نے کئی فلم کمپنیاں قائم کیں، اُن کا دیوالہ نکالا۔ اب انھوں نے ہندوستان سنے ٹون کے نام سے ایک نئی فلم کمپنی قائم کی تھی جس کے قیام کے ساتھ ہی دیوالے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

میں نے اس کمپنی کے لئے "مڈ" یعنی کیچڑ، کے عنوان سے ایک کہانی لکھی جو بہت پسند کی گئی۔ یہ اشتراکی خیالوں پر استوار کی گئی تھی۔ مجھے حیرت ہے، اُس زمانے میں سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی نے اسے کیوں پسند کیا۔

میں مکالمے لکھنے میں مصروف تھا کہ مجھ سے کسی نے کہا کہ رفیق غزنوی

اسٹنڈیو میں موجود ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔ پہلا سوال جو میرے
دماغ میں پیدا ہوا یہ تھا کہ وہ مجھے کیسے جانتا ہے۔ میں کچھ سوچ
ہی رہا تھا کہ ایک لم تڑنگ آدمی بہت عمدہ سلے ہوئے سوٹ میں
نمودار ہوا ـــــ یہ رفیق غزنوی تھا۔

اُس نے کمرے میں اندر داخل ہوتے ہی مجھے موٹی گالی دی اور
کہا "تم یہاں چھپے بیٹھے ہو"

اسی لمحے ـــــ اسی ثانیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں رفیق غزنوی
کو ازل سے جانتا ہوں۔ چنانچہ ہم دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں بڑے بے تکلف
انداز میں کرتے رہے۔

اُس کے لب و لہجے، اُس کی حرکات و سکنات میں ایک عجیب سطحی
قسم کا لااُبالیانہ پن تھا ـــ جو تصویر میں نے عاشق علی فوٹوگرافر کے
ڈارک روم میں ڈش کے اندر، پانی میں ڈبکیاں لگاتی دیکھی تھی۔ اُس میں
اور گوشت پوست کے رفیق غزنوی میں یہ فرق تھا کہ وہ گونگی تھی
اور یہ متکلم۔ لیکن اُس کے تکلم کا انداز اُس پر سجتا نہیں تھا۔ اگر اُس کے
ہونٹ نہ کھلتے، اگر کھلتے تو بے ہنگم طریق پر نہ کھلتے جو اُس کے بھدے
دانتوں اور مسوڑوں کی بے وجہ نمائش کرتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ
ہوتا۔ اگر اُس کی گفتگو میں بازاریت کا رنگ نہ ہوتا تو میں شاید اُس کے

بھدے دانتوں اور مسوڑھوں کو بھی برداشت کر لیا مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔

اُس کے ہاتھ نچانے کا انداز بھی مجھے پسند نہ آیا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ وہ جس سے مخاطب ہے، بڑے اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ احساس ظاہر ہے کہ میرے لئے خوشگوار نہیں تھا۔ بہر حال چونکہ پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی اتنے اشتیاق کے بعد، میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا گہرا اثر نہ لیا۔

جب رفیق جانے لگا تو اُس نے مجھے بتایا کہ وہ بمبے سنٹرل اسٹیشن کے سامنے ایک ہوٹل میں (جس کا نام میں بھول گیا ہوں) ٹھہرا ہے۔ وہ بڑی بے سر و سامانی کی حالت میں لکھنؤ سے آیا تھا۔ اُس کو اُمید تھی کہ بمبئی میں اُسے کام مل جائے گا۔

چونکہ اُس نے مجھے مدعو کیا تھا، اس لئے میں شام کو اُس کے ہوٹل میں پہنچا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد اُس کا کمرہ مل گیا — اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے ایک کونے میں قالین کے ایک ٹکڑے پر وہ چبوترہ نظر آیا جو ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دوسرے کونے میں رفیق کے بستر اور جوتے تھے جو بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ پھر مجھے ایک عورت نظر آئی جس کے طوائف ہونے پر،

کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، یہ زہرہ تھی (جو اب زہرہ مرزا ہے۔ مرزا صاحب کسی زمانے میں فلم ڈائرکٹر تھے۔ اب پندرہ سولہ برس سے وہ فلم کمپنی کھولنے کی کوشش میں مصروف ہیں)

زہرہ کے ساتھ دو بچے تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ لڑکا چھوٹا تھا۔ لڑکی بڑی جس کا نام پروین تھا (یہ فلمی دُنیا میں شاہینہ کے نام سے داخل ہوئی۔ پہلا فلم "بیلی" تھا جس کی کہانی میری تھی۔ یہ بہت بُری طرح ناکام ہوا) اُس کی عمر اُس وقت پانچ برس کی ہوگی۔

دیکھئے، میں لکھتے لکھتے واقعات کی رَو میں ایسا بہا کہ آپ کو یہ بات بتانا بھول ہی گیا کہ جب میں فلمی دُنیا میں داخل ہوا یعنی جب میں نے امپیریل فلم کمپنی میں بطور "منشی" ملازمت کی تو اُس زمانے میں دو نوجوان لڑکیاں لائی گئیں۔ ایک دبلی تھی، دوسری موٹی۔ (یہ زہرہ کی چھوٹی بہنیں تھیں، شیداں اور میراں)

شیداں بلا کی چنچل تھی۔ بوٹی بوٹی پڑی ناچتی تھی۔ ناک نقشہ اچھا۔ لیکن بہت تیز بولتی تھی۔ اتنی تیز کہ ایک لفظ دوسرے لفظ پر سوار ہو جاتا۔ مجھے اُس سے گفتگو کرتے وقت بہت اُلجھن ہوتی تھی۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ بھیکو بھائی جان (رفیق غزنوی) انوری کو چھوڑ چکا ہے اور اُس نے اُس کی بڑی بہن زہرہ سے بیاہ کر لیا۔

ہمیراں موٹی اور پھسپھس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلموں میں نہ چل سکی۔ شیداں کو امپیریل کی رنگین فلم "ہندماتا" میں کام مل گیا جو کامیاب رہا۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناتا ہوں۔ ایک روز میں کسی کام سے امپیریل فلم کمپنی کے مالک سیٹھ آرڈیشر ایرانی سے ملنے گیا۔ دفتر کا 'سوئنگ ڈور' کھولتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ سیٹھ بڑے اطمینان سے شیداں کا ایک پستان یوں دبا رہے ہیں جیسے کسی موٹر کار کا ہارن ——— میں اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔

اب میں پھر زہرہ کی لڑکی پروین کی طرف آتا ہوں۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں جس طرح زرینہ المعروف نسرین کی ہیں۔ رفیق کی آنکھیں نیلی نہیں۔ انوری اور زہرہ کی بھی نہیں اور یہ دونوں بالترتیب زرینہ اور شاہینہ کی مائیں ہیں۔ اصل میں آنکھوں کا یہ نیلاپن ان لڑکیوں کو ان کی دادی سے ملا ہے۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نیلگوں تھیں۔ قد کاٹھ کی بہت تگڑی تھی مگر پنیا بیگم کی رسیا۔

خیر ——— رفیق مجھ سے ملا۔ میں کمرے کا جائزہ لیتے ہی بھانپ گیا تھا کہ وہ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں یہاں آیا ہے اور تلاشِ روزگار میں سرگرداں۔

میں یہاں آپ کو رفیق کی عجیب و غریب شخصیت کا ایک عجیب و غریب پہلو دکھانا چاہتا ہوں۔ جب اُس پر بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کا زمانہ آتا ہے تو وہ بہترین لباس پہنتا ہے۔ جب یہ دور گذر جاتا ہے تو وہ معمولی کپڑے پہننے لگتا ہے ـــــ یوں وہ ہر لباس میں بانکا سجیلا نظر آتا ہے۔ اُس کو ہر لباس پہننے کا سلیقہ ہے۔

ہوٹل کے کمرے میں ہم تھوڑی دیر رہے۔ اس کے بعد نیچے باغیچے میں چلے گئے۔ میں وسکی کی بوتل اپنے ساتھ لایا تھا، چنانچہ ہم دیر تک پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں ایک دلچسپ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

ہم پی رہے تھے کہ ایک بھرے بھرے جسم اور اچھے خاصے ڈیل ڈول کی عورت آئی۔ اس نے رفیق کی طرف اپنی چندھی آنکھوں سے دیکھا اور مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ رفیق نے اُس کو گلاس پیش کیا جو اُس نے لے لیا۔ اس کے بعد رفیق نے میرا اُس سے تعارف کرایا۔

وہ کوئی فلم زدہ عورت تھی۔ میں عورت ہی کہوں گا اس لئے کہ وہ لڑکپن کے حدود سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ وہ سکھ مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور کافی مالدار ہے۔ بمبئی صرف اس لئے آئی ہے کہ اشوک کمار کے صرف ایک بار درشن ہو جائیں۔ میں نے

اس سے کہا ہے، سالی چھچھڑا اشوک کمار کو۔ اپنا ڈیل ڈول دیکھ تھاری چھاتی پر اگر اشوک کمار کو بٹھا دوں تو ایسا معلوم ہوگا طوطا توپ چلا رہا ہے"۔

پھلجھڑی چھوڑنا رفیق کا محبوب ترین مشغلہ ہے، بلکہ یوں کہئے کہ یہ اس کی طبیعت بن چکا ہے۔ وہ لکھمنی (جس کا نام میں بھول گیا ہوں) یہ پھبتی سن کر خاموش رہی۔ لیکن رفیق نے بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا اور دیر تک ہنستا رہا۔

یہ بھی اس کی عادت ہے کہ پھبتی کہے گا، چست ہو یا پھسپھسی۔ کوئی داد دے نہ دے، لیکن وہ خود اپنے کو خوب داد دے گا۔ اتنا ہنسے گا، اتنا شور مچائے گا کہ مجبوراً آپ کو بھی اس غل غپاڑے میں شریک ہونا پڑیگا۔

سکھنی معمولی شکل صورت کی تھی۔ موٹے موٹے نقش۔ بہت ہی تنگ ماتھا۔ مرد نما۔ رفیق اس سے باتیں کر رہا تھا، مگر مجھے احساس تھا کہ اسے اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی باتیں محض پہلے باتیں تھیں۔ وہ اس پر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے جسمانی رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے مگر اس کے دل و دماغ پر اشوک کمار سوار تھا۔ رفیق نے جب زور دیا تو وہ ٹھیٹ دیہاتی سکھنیوں کے انداز میں جھنجھلا کے بولی "سن لے رفیق! میں کنتوں ...."

رفیق نے فوراً اسے ٹوکا: "بس بس بس .... تم نہیں جانتی ہو۔

میں بہت بڑا کتا ہوں۔ بڑی اعلیٰ نسل کا۔"

نسل وسل کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ زینؔ غزنوی واقعی بہت بڑا کتا ہے جس کی دُم صرف طوا ئفیں ہی ہلا سکتی ہیں کوئی شریف خاتون لاکھ پچکارے چمکارے اُس کی دم میں خفیف سی بھی جنبش پیدا نہیں ہوگی۔

یہ میری اُس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملتے جُلتے رہے۔ میں یہاں اُس کے کردار کا ایک اور پہلو واضح کردوں کہ وہ اوّل درجے کا کمینہ، سفلہ اور خود غرض ہے۔ اپنی ذات اُس کیلئے سب سے مقدم ہے۔ وہ کھانا جانتا ہے، کھلانا نہیں جانتا۔ لیکن مطلب ہوگا تو وہ بڑی پُرتکلف دعوتیں بھی کرے گا مگر ان دعوتوں میں بھی وہ مہمانوں کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے سب سے پہلے مرغ کے بہترین حصے اپنی پلیٹ میں ڈال لے گا۔

وہ دوستوں کو بہت کم سگرٹ پیش کرتا ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سُناتا ہوں جب مجھے بڑی خفّت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک اسٹوڈیو میں اُس سے ملاقات ہوئی۔ جنگ کا زمانہ تھا سگرٹوں کے تمام اچھے برانڈ بلیک مارکٹ میں بکتے تھے۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں کریون اے کا ڈبہ دیکھا۔ یہ میرے مرغوب سگرٹ ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈبہ پکڑنا

چاہا، مگر اُس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر ایک طرف کر لیا۔ میں نے کہا "ایک سگرٹ دینا یار!"

رفیق نے پیچھے ہٹ کر ڈبہ اپنی جیب میں ڈال لیا "نہیں منٹو ۔۔۔۔ اوّلاً میں اپنا سگرٹ کسی کو دیا نہیں کرتا۔ ثانیاً یہ سگرٹ اعلیٰ درجے کے ہیں۔ تمہاری عادت بگڑ جائے گی۔ تم اپنے گولڈ فلیک پیا کرو۔"

میرے جاننے والے تین چار آدمی پاس کھڑے تھے۔ میں پانی پانی ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا، کیا کہوں اور کیا کہ دوں۔ ناچار کھسیانا ہو کر اپنی ٹانگ نوچنا شروع کر دی۔

رفیق پرلے درجے کا بے غیرت۔ کہنے کو تو پٹھان ہے لیکن غیرت قطعاً نہیں۔ سنا ہے کہ پہلے اُس کا سلسلہ زہرہ کی ماں سے تھا۔ اس کے بعد اُس کی بڑی لڑکی مشتری سے ہوا۔ پھر زہرہ کی باری آئی، آٹھویں مشیداں کی۔

مجھے معلوم نہیں شیداں سے اُس کا ٹانکا کیسے ملا۔ اتنا یاد ہے کہ وہ اُن دنوں ماہم ہی میں رہتا تھا۔ اینکلیو ڈمینشن کی بالائی منزل پر اُس کا فلیٹ تھا۔ اس کے سامنے میری بہن رہتی تھی۔

میری شادی ہو چکی تھی اور میں اڈلفی چیمبرز کلیئر روڈ میں مقیم تھا۔ رفیق کا ہمارے یہاں آنا جانا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر بھی ہماری اکثر ملاقات

ہو جاتی تھی۔ ایک روز وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹڈیو سے باہر نکلا تو بڑی افراتفری میں تھا۔ دیر کے بعد ملا تھا، اس لئے میں نے پوچھا "سناؤ رفیق کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

اُس نے جواب دیا "عشق ہو رہے ہیں ۔۔۔ دُبلے ہو رہے ہیں"

واقعی عشق ہو رہے تھے۔ کیونکہ ایک دن معلوم ہوا کہ زہرہ کی چھوٹی بہن خورشید (شیداں) نے افیم کھالی ہے۔ (زہرہ بھی چُھپا بیگم کی عاشق ہے) دونوں بہنوں میں زبردست ٹھن ہوئی تھی۔ زہرہ کو سخت ناگوار گذرا تھا کہ شیداں اُس کے خاوند کو اُس سے چھین رہی ہے۔ اُدھر بچاری شیداں جس کو معلوم نہیں اُس کا پھپکو بھائی جان اُسے محبت کے کتنے جام پلا چکا تھا، سر سے پیر تک نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں عشق اور جنگ میں ہر ایک چیز جائز ہے، خود کو حق بجانب سمجھتی تھی اور پھر خود رفیق اُس کی طرف مائل تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس کی بڑی بہن معترض کیوں ہے ۔۔۔ ٹھن زبردست لڑائی کی شکل اختیار کر گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیداں نے زہرہ کی افیم اُڑا کر نگل لی تاکہ عشق کی راہ میں اپنی جان دے دے۔ لیکن جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ وہ شہادت کا رتبہ حاصل کرنے کرنے بچ گئی اور اس حادثے کا انجام بخیر یوں ہوا کہ رفیق، زہرہ کے دل کا مکان خالی کر کے شیداں کے

دل کی نئی کوٹھی میں اقامت پذیر ہو گیا۔

سُنا ہے کہ تعطیلوں میں وہ کبھی کبھی شیداں کی موسیٰ بہن ہیراں کے دل کے ڈاک بنگلے میں بھی ٹھہر جایا کرتا تھا ۔۔۔ یہ ہے نام اللہ کا اور اُس کے ایک ناچیز بندے رفیق غزنوی کا۔

جب رفیق کا عشق زوروں پر تھا، اُس زمانے میں لیڈی جمشید جی رودڑما ہم کے گلشن محل میں لاہور کے ایک لالہ جی آکے ٹھہرے۔ آپ کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی زیب النساء تھی۔ لالہ جی عجیب وغریب آدمی تھے۔ آگ لگانے کو بھی روپیہ کافی تھا۔ اُن کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اُن کی زیب پس پردہ کیا کرتی ہے، کیا نہیں کرتی۔ وہ اپنے چند پیسے میں مست رہنا چاہتے تھے۔ رفیق دو ایک مرتبہ لالہ جی سے ملنے آیا تو اُس کی آنکھ زیب سے لڑ گئی۔ لڑکی سادہ لوح تھی۔ عزیب نے گھر کی سب اچھی چادریں، غلاف، دریاں وغیرہ رفیق کے حوالے کر دیں۔ اُس کو کھلاتی پلاتی بھی رہی۔ لیکن رفیق بہت جلد اُس سے اُکتا گیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا، "بڑی شریف عورت ہے ۔۔۔ مجھے لطف نہیں آتا۔"

رفیق کو عورت میں شرافت بہت بری طرح کھلتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ اُس کا واسطہ چونکہ شروع ہی سے ایک ایسے

طبقے کی عورتوں سے پڑا تھا، فحش کلامی اور جگت بازی جن کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے، جو سستے اور بازاری قسم کے مذاق کرتی ہیں اور ایسے ہی ہنسی ٹھٹھے کی دوسروں سے توقع کرتی ہیں۔ اس لئے رفیق کے لئے شریف خواتین میں کوئی کشش نہیں تھی ——— اُس کی جسمانی حسیات کو بھی بیدار نہیں کر سکتا تھا۔

کہنے کو تو وہ ہر اُس طوائف کا شوہر تھا جو اُس کی نیم بازارانہ زندگی میں آئی، لیکن درحقیقت وہ اُس کا گاہک تھا ——— عام گاہک نہیں ——— خاص گاہک، (جو طوائف سے لیتا ہے، اُس کو دیتا نہیں) جیسا کہ رفیق اپنی ابتدائی زندگی میں تھا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ زندگی بھی رفیق کے نزدیک ایک طوائف ہے۔ وہ ہر رات اُس کے ساتھ سوتا ہے۔ صبح اُٹھتے ہی پہلے سانس کے ساتھ وہ اُس سے جگت بازی شروع کر دیتا ہے اُس کا گانا سنتا ہے، اپنا سناتا ہے۔ پھکڑ بازی ہوتی ہے اور یوں ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔

میں نے اُس کو کبھی ملول نہیں دیکھا۔ وہ بے حیائی اور ڈھٹائی کی حد تک ہر وقت خوش رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تندرست ہے۔ اتنی عمر ہونے پر بھی آپ اُسے معمر نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ جوں جوں

اُس کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے وہ جوان ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر سو برس پورے ہونے پر وہ ننھا منا بچہ بن جائے اور انگوٹھا چوسنا شروع کر دے۔

وہ شوا جی پارک میں رہتا تھا۔ شیداں کے مُردہ بچہ پیدا ہوا۔ میں اور میری بیوی افسوس کرنے گئے تو ایک عجیب و غریب تماشا دیکھنے میں آیا۔

رفیق فرش پر قراقلی ٹوپی پہنے نماز پڑھنے کے انداز میں بیٹھا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو دوسرے کمرے سے زہرہ سیاہ ماتمی لباس میں نمودار ہوئی۔ بال کھلے تھے اور آنکھیں نمناک۔ اُس کے ساتھ اُس کا شوہر مرزا تھا جو رفیق کے لڑکے کی موت سے بہت متاثر دکھائی دیتا تھا۔ دوسرے کمرے سے شیداں کے رونے کی آواز آئی تو زہرہ لپک کر اندر گئی اور بلند آواز میں اُس کو دلاسا دینے لگی۔ میں رفیق کے پاس مبہوت بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیا مذاق ہے۔

رفیق کسی زمانے میں زہرہ کا خاوند تھا۔ اس کے بطن سے رفیق کے دو بچے تھے، جو اس کمرے سے اُس کمرے میں جاتے اور کبھی اُس کمرے سے اِس کمرے میں آتے۔ رفیق اب زہرہ کی بہن شیداں کا شوہر تھا اور زہرہ کا مرزا۔ شیداں، زہرہ کی بہن تھی اور سوت بھی۔ رفیق کہتے تھے شیداں

کے کیا گنے تھے۔ بہن کے رشتے سے ظاہر ہے، پروین بھانجی اور محمود بھانجا۔ اور شیداں کے جو مُردہ لڑکا پیدا ہوا ہے، وہ زہرہ کا بھانجا۔ پروین اور محمود کا رشتہ رفیق کے نطفے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس مُردہ لڑکے سے جو ہوا وہ ظاہر ہے ــــ رفیق اور مرزا دونوں ایک دوسرے کے ہم زُلف ہوئے ــــ میں چکرا گیا۔ لیکن رفیق نے بروقت مجھے اس اُلجھن سے نجات دی اور کہا "آؤ باہر چلیں"۔

ہم برآمدے میں پہنچے تو رفیق نے قراقلی اُتار کر زور سے ایک طرف پھینکی اور سگرٹ سُلگا کر کہا "درستِ فتح محمد ــــ غم کرتے کرتے چہرہ لمبوترا ہو گیا ہے" اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

غیرت، شرم اور حیا شاید اضافی چیزیں ہیں۔ آپ مجھ سے بحث کریں گے تو میں مان لوں گا کہ یہ واقعی ہیں۔ بہن بھائی کے ازدواجی رشتے میں کیا قباحت ہے۔ باپ بیٹی کے جسمانی تعلق میں کیا بُرائی ہے۔ اسی طرح اغلام بازی کو خلافِ وضع فطری عمل کیوں قرار دیا جاتا ہے جب کہ یہ رجحان انسان کی فطرت میں ازل سے موجود ہے ــــ کچھ بھی ہو۔ آپ مجھے کمزور کہہ لیجئے، رجعت پسند بتا دیجئے، لیکن ان باتوں کے تصور ہی سے مجھے گھن آتی ہے۔

عرصہ ہُوا، میں ملیجے سے اپنے کسی مقدمے کے سلسلے میں لاہور

آیا۔ ان دنوں رفیق بھی وہیں تھا۔ اُس سے ملاقات سید سلامت اللہ شاہ کے نیلام گھر میں ہوئی۔ اللہ بخشے شاہ صاحب بڑے رنگیلے آدمی تھے۔ میں نے اُن سے رفیق کا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اندر کمرے میں ہے اور بہت خوش ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ امرتسر میں اپنی بیٹی زرینہ المعروف نسرین (انوری کے بطن سے) سے ملاقات کر کے آیا ہے۔ رفیق نے اُس کا بچپن دیکھا تھا۔ اُس کی جوانی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اصل میں انوری نے کوئی ایسا موقعہ ہی نہیں آنے دیا تھا کہ نسرین اپنے باپ کو دیکھ سکتی۔ اُس سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ بہت بدصورت اور بدمعاش ہے۔

رفیق کے دوستوں نے مل جل کر منصوبہ بنایا اور باپ بیٹی کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ رفیق امرتسر پہنچا اور زرینہ سے ملا۔ رفیق نے مجھ سے کہا "منٹو ـــــ سرو قد۔ بے حد خوبصورت۔ جوانی سے بھرپور۔ میں نے جب اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچا تو خدا کی قسم مزا آگیا!"

میں اُس کے اِن الفاظ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

رفیق نے مجھے بتایا کہ وہ رخصت ہونے ہی والا تھا کہ انوری

آن ٹکی۔ ہلکی سی بچ ہوئی۔ رفیق نے اُس سے کہا: خاموش رہ انوری۔
—— شکر یہ ادا کر کہ تجھے ایک سونے کی کان کا مالک بنا دیا ہے میں
نے "۔

معلوم نہیں رفیق نے ایسی سونے کی کانیں کس کس کو عطا کی ہیں۔
روزِ محشر جب کھدائی ہوگی، اُسی وقت پتا چل سکے گا۔ ویسے رفیق نے
ایک بار مجھ سے کہا تھا " مجھے معلوم نہیں میرے بچے، بچیوں کی تعداد کتنی
ہے —— اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ سب سے بڑا مردم شمار ہے "۔
رفیق کی ایک سگی " بیوی بھی تھی، یعنی سہرے جلووں کی بیاہی یہ
غریب شادی کے تین چار سال بعد ہی مر گئی۔ اس کے بطن سے ایک
لڑکی ظاہرہ ہے جو پہلے فلم ڈائرکٹر ضیا سرحدی کی بیوی تھی اور اب
طلاق لے کر کراچی میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔
مجھے اس لڑکی کی زندگی کی قبل از وقت تباہی کا بہت افسوس
ہے، اور میں سمجھتا ہوں اس تباہی میں رفیق کا ہاتھ ہے، اس لئے کہ وہ
ہمیشہ اُس کو اپنی زندگی کا سانچہ پیش کرتا تھا اور کہتا تھا، تم اس میں
ڈھل جاؤ۔ یہ حقیقت اُس کی آنکھوں سے معلوم نہیں کیوں اوجھل رہی؟
نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ آج ایک عبرت انگیز خرابے میں تبدیل ہو
چکی ہے۔ اُس کی شادی کے متعلق بمبے میں ایک جھگڑا سا پیدا ہو گیا

تھا۔ وہ بھی رفیق کی غفلت کے باعث۔ اس کو دور کرنے کے لئے اس نے ظاہرہ سے کہا "دیکھ پتر۔ تو نذیر لدھیانوی سے شادی نہیں کرنا چاہتی نہ کر۔۔۔ ضیاء سرحدی سے کر۔ تذبذب میں ہے تو دونوں سے کر لے۔ اگر یہ تمہیں دھوکا دے گئے تو کوئی فکر نہ کرنا۔۔۔ میں تیرا سب سے بڑا خاوند ہوں۔ تیرا باپ"

نذیر لدھیانوی کو ظاہرہ نے دھوکا دیا۔ ظاہرہ کو ضیا سرحدی نے۔ اب وہ اپنے سب سے بڑے خاوند۔۔۔ اپنے باپ رفیق غزنوی کے پاس ہے۔ بیٹر بال پہنتی ہے اور اُن کی راکھ میں اپنی جوانی کی وہ تمام چلبلاہٹیں کرید کرید کر نکالنے کی ناکام کوشش کرتی ہے جو کوئی مستقل سنجیدہ شکل اختیار کر سکتی تھیں۔

میں ظاہرہ کے متعلق اور کچھ نہیں لکھوں گا اس لئے کہ میرے دکھ میں اضافہ ہوگا۔

رفیق میں کھلنڈرہ پن اس عمر میں بھی موجود ہے۔ چھوٹی سی بات ہوگی اور وہ ہنس ہنس کر اپنا برا حال کرے گا۔ بہت خوش ہوگا تو اچھلنا کودنا شروع کر دے گا۔

ہم فلمستان میں "چل چل رے نوجوان" بنا رہے تھے۔ ہیرو اشوک اور ہیروئن نسیم بانو (پری چہرہ) تھی۔ رفیق اس فلم میں ایک رول ادا

کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نسیم کی ماں چھمیاں (شمشاد) کو جانتا ہے جو کسی زمانے میں دِلّی کی نہایت خیز طوائف تھی۔

دِلّی میں ایک رات اُسے چھمیاں کے بالاخانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ چھمیاں گا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بلّوریں صراحی سے جام بھر بھر کے پی رہی تھی۔ مجرا سُننے والے اور بھی تھے۔ شہر کے رئیس۔ چھمیاں اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرائی اور اشارے سے اپنے پاس بُلا کر ایک جام پیش کیا ــــ رئیس پیتے گئے اور وہ بند رہ روز تک اُس کے بالاخانے میں زیرِ حراست رہا۔

میں نے نسیم سے اُس کا تعارف کرایا۔ رفیق نے اُس کو جب دِلّی میں دیکھا تو وہ چھوٹی سی بچی تھی جو بقول رفیق ہر وقت چِنّر باوٹے ادھر اُدھر پُھدکتی رہتی تھی۔

نسیم، رفیق کو جانتی تھی۔ اُن میں جو گفتگو ہوئی بہت پُر تکلف تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسیم ادب آداب اور رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتی ہے۔ اُس نے رفیق کو ایسا کوئی موقعہ نہ دیا کہ وہ "ڈھیلی" قسم کی بات کر سکتا۔ لیکن وہ اسی میں خوش تھا۔ اتنا خوش کہ میرے کمرے میں پہنچتے ہی اُس نے بے تحاشا ناچنا شروع کر دیا۔ نسیم کے حُسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا وہ میز پر چڑھا۔ وہاں سے دھم کر کے فرش

پہ گرا اور لوٹنے لگا۔ لوٹتے لوٹتے میز کے نیچے چلا گیا۔ اُٹھا تو اُس کا سر تڑاق سے اُس کے ساتھ ٹکرایا۔ اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اُس کے نیچے سے نکلا اور گانے لگا۔

وہ چلے، جھٹک کے دامن میرے دستِ ناتواں سے

وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ چلے ۔۔۔ وہ چلے ۔۔۔ وہ چلے

میرا خیال ہے رفیق چاہتا تھا کہ نسیم بانو سے بھی سلسلہ ہو جائے، مگر انگور کھٹے تھے، اس لئے اُس نے کوشش فضول سمجھی اور دور سے دیکھ دیکھ کر ہی اپنا "جی پشوری" کرتا رہا۔

نورجہاں غالباً اُس کے ہتے چڑھ جاتی، لیکن وہ بہت بری طرح فلم ڈائرکٹر سید شوکت حسین رضوی کی محبت میں گرفتار تھی۔ میں اس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے اپنے مضمون "نورجہاں سرورِ جاں" میں لکھ چکا ہوں۔ البتہ رفاقت ستارہ بغیر رفیق کی خواہش کے اور بغیر اپنے ارادے کے سرفراز ہو گئی۔

ادھر نذیر اور اُس کا جھگڑا تھا۔ بیچ میں نذیر (ایکٹر) بھی تھا۔ اس تگڈم کی گرہیں کھولتے کھولتے رفیق نے ستارہ کی گرہ بھی کھول دی۔ کچھ اس طرح کہ اس کا پتہ رفیق کو چلا نہ ستارہ کو۔

سہراب مودی "سکندر" بنا رہا تھا۔ ظہور احمد "پون پل" (بمبئی

میں جسم فروشوں کی منڈی) سے ایک نووارد اور نوجوان طوائف مینا کو لے اڑا تھا۔ اس نے اس نوخیز کو اپنی بیوی بنالیا تھا۔ وہ مہزوا موری ٹاؤن میں ملازم تھی۔ رفیق غزنوی نے "سکندر" کے لیے ایک مارشل کورس مرتب کیا۔ اس کے بول شاید یہ تھے۔

زندگی ہے پیار سے پیار سے بتائے جا
حسن کے حضور میں اپنا سر جھکائے جا

یہ کورس بہت مقبول ہوا۔ شاید اسی خوشی میں اس نے مینا کے حسن کے حضور میں اپنا سر جھکا دیا، مگر زیادہ دیر تک جھکائے نہ رکھا تین چار سجدے کئے اور مصلے اٹھا کر چل دیا۔

پونا پل ہی میں حیدرآباد سے دو بہنیں غالباً شہزادہ معظم جاہ سے اپنی جان چھڑا کر آباد ہوئیں۔ بڑی کا نام اختر تھا چھوٹی کا انور۔ ان کا وطن در اصل آگرہ تھا۔ انور بالی عمر کی تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی۔ دونوں مجرا کرتی تھیں۔ انور کی مسی کی رسم ابھی تک ادا نہیں ہوئی تھی۔ بڑی پر ہمارے دلّی کے ایک دوست ہلدیہ صاحب سو جان سے فدا تھے۔

ایک رات مجھے ہلدیہ صاحب کے ساتھ ان دو بہنوں کے بالاخانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجرا سننے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو رفیق غزنوی

کا ذکر آیا۔ میں نے کہا "بڑا حرامزادہ ہے۔"

چھوٹی انوری نے ایک تیکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "آپ کی شکل اُس سے ملتی جُلتی ہے۔"

مجھ سے کوئی جواب بن نہ آیا اور پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

اس دلچسپ واقعے کا ذکر میں نے رفیق سے کیا۔ وہ اُن کو نہیں جانتا تھا۔ مجھ سے پتہ پوچھ کر اُس نے اُن کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ میرا خیال ہے یہ سلسلہ کم از کم ایک برس تک جاری رہا۔ رفیق نے پیشگوئی کی کہ انوری ایک دن بہت بڑی مغنیہ بنے گی اور ٹھمری گانے میں اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ یہ صحیح ثابت ہوئی۔ جن لوگوں نے اُسے سُنا ہے، اس کی تصدیق کریں گے۔

بمبے کے بعد میں نے انوری بائی آگرے والی کو دلّی ریڈیو اسٹیشن میں دیکھا جہاں میں اُن دنوں ملازم تھا ——— ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ اللہ اللہ کیا انقلاب تھا۔ چند برسوں ہی میں یہ کایا پلٹ ——— وہ چُلبلا پن، وہ شرارہ اور تیکھا غمزہ معلوم نہیں کون ظالم اُس کے وجود سے نوچ کر لے گیا تھا۔ اب وہ ایک لمبی آہ تھی، بڑی نازک ہوا کے ہلکے سے ہلکے رسے سے بھی جس کے ہزار ٹکڑے ہو سکتے تھے۔

مائیکروفون کے سامنے گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھی اور تانپورے

کے ساتھ اپنی سر لگا دیتی کہ اُس کی نحیف گردن کو سُر کا سارا بوجھ نہ
اُٹھانا پڑے ـــــ پھر وہ گاتی اور اُس کی آواز سننے والوں کی رُوح کی
گہرائیوں میں اُتر جاتی۔

رفیق گویا کم ہے حواری زیادہ ہے۔ وہ آپ کو اپنا گانا سُنانے
سے پہلے ہی وجد میں لے آئے گا۔ باجے کے کسی سُر پہ اُنگلی رکھے گا اور
خود پہ سرتاپا رقت طاری کر کے کہے گا "ہائے" یہ ہائے بہت لمبی ہوگی۔
پھر وہ دوسرے سُر کو دبائے گا اور اس سے بھی لمبی "ہائے" اُس کے حلق
سے نکلے گی جو سامعین کے رونگٹے کھڑے کر دے گی۔ اس کے بعد وہ
باجے میں مزید ہوا بھرے گا۔ اُس کی آنکھوں کی پُتلیاں اوپر چڑھ جائیں گی
ایک جگر دوز آہ اُس کے سینے کی گہرائیوں سے نکلے گی اور جب وہ
کسی اور سُر پہ اُنگلی رکھے گا تو اُس پہ حال کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔
قریب ہو گا کہ سننے والے اپنے کپڑے پھاڑنے اور سر کے بال نوچنے لگیں
کہ ایک دم وہ بے تحاشہ ہنسنا شروع کر دے گا اور باقاعدہ گانے لگے گا۔
آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ پیاسی زمین پہ ساون کی جھڑی کھل کر برس جانے
کے بعد کوئی ماشکی اپنی مشک سے چھڑکاؤ کر رہا ہے۔

گاتے وقت بہت بُرے بُرے منہ بناتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُسے
قبض ہے۔ اُس کے پیٹ میں شدت کا درد ہے جس کے باعث وہ

پیچ و تاب کھا اور کراہ رہا ہے۔ اُس کو گلے نے دیکھ کر (خاص طور پر جب وہ کوئی پکا گانا گا رہا ہو) یا تو خود آپ کو تکلیف ہو گی یا اُس کی حالت پہ ترس آئے گا اور آپ خلوص دل سے دعا کریں گے کہ خدا اُسے اس کرب سے نجات دلائے۔

عذرا میر نے بمبے کے بہت دولت مند یہودیوں سے مل کر لاکھوں کے سرمائے سے ایک فلم کمپنی قائم کی تو اپنے پہلے فلم "ستارہ" کے میوزک کے لئے رفیق غزنوی کو منتخب کیا۔ عذرا میر خوبصورت ہے۔ اُس کے ساتھی، یہودی سرمایہ دار بھی خوش شکل اور رعب داب والے تھے۔ رفیق جب ان کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا تو بالکل الگ نظر آتا تھا۔ اُس کی شان ہی دوسری تھی۔

رفیق جب کام شروع کرتا ہے تو بڑے ٹھاٹ سے۔ ایک سو سازندے ہوں گے جن کے جھرمٹ میں کھڑا وہ سب کو ہدایات دے رہا ہو گا۔ پنجابی میراثیوں کے ساتھ میراثی پن چلے گا۔ بات بات پہ پھبتیاں اور جگت۔ جو کرسچین ہیں، اُن سے انگریزی میں مذاق ہوتے رہیں گے۔ جو یو۔پی کے ہوں گے اُن سے اُردو میں شستہ کلامی ہو گی۔

ایک دن رفیق دفتر میں عذرا میر کے ساتھ بیٹھا فلم کے کسی گانے کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ کوئی بات کرنے

کہتے وہ فوراً رُک گیا۔ دفتر سے دُور میوزک روم تھا۔ وہاں سازندے اُس کی ایک کمپوزیشن کی ریہرسل کر رہے تھے۔ رفیق نے اپنے کان کا رُخ اُس طرف کیا جہاں سے آواز آ رہی تھی اور ناک بھوں چڑھا کر بڑے اذیت بھرے لہجے میں کہا "ڈیش اِٹ —— ایک وائلن آوٹ اوف ٹیون ہے!" اور اُٹھ کر میوزک روم کی طرف چلا گیا۔

مجھے موسیقی سے کوئی شغف نہیں۔ گو میں نے اپنے وقت کے تمام بڑے بڑے گانے والوں اور گانے والیوں کو سُنا ہے لیکن راگ دو یا نہیں سیکھ سکا۔ لیکن میں رفیق کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ سُر پایا نہیں۔ موسیقی کا علم وہ کہاں تک جانتا ہے اس کے بارے میں رائے دینا میری طرف سے بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ البتہ وہ لوگ جو خود موسیقار ہیں اور جن کا موسیقی کے میدان میں کافی نام ہے، اُن میں سے اکثر کا یہ کہنا ہے کہ رفیق بے سُرا ہے۔ سُر سے ایک ایک دو دو "سوتر" ہٹ کے گاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تھوڑے ہی دن ہوئے نورجہاں سے باتیں ہو رہی تھیں کہ رفیق کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے اُس سے رفیق کے بارے میں دوسروں کی مندرجہ بالا تنقیص کا ذکر کیا تو اُس نے جیب دانتوں تلے دبا کر اور دونوں کانوں کو اپنی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا "توبہ، توبہ

— یہ محض افترا ہے — وہ اُستاد ہے۔ اپنی طرز کا واحد مالک"۔

لیکن اُس نے یہ تسلیم کیا کہ اب رفیق کی آواز میں وہ پہلی سی چمک دمک نہیں رہی اور یہ محض عمر کا تقاضا ہے، جہاں تک علم کا تعلق ہے نورجہاں اُس سے گنی گنی ہے۔

اُس کے ایک گُن کا میں بھی معترف ہوں۔ وہ بے شرم ہے، بے حیا ہے، بے غیرت ہے، لیکن اوباش نہیں۔ اُس کی افتاد عام آدمی کی نہیں ایک آرٹسٹ کی افتاد ہے۔ وہ اگر شریعت کا پابند نہیں تو مروّجہ قوانین کا پابند ضرور ہے۔ وہ اگر کسی کا دوست نہیں تو کسی کا دشمن بھی نہیں۔ وہ اگر صحیح معنوں میں کسی عورت کا شوہر نہیں تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں آج تک اُس نے کسی عورت کو مجبور نہیں کیا کہ وہ صحیح معنوں میں اُس کی بیوی بنے۔

شریف عورتیں چونکہ اُس کی مطلب کی نہیں اس لئے وہ ان کا احترام کرتا ہے۔ غیر شریف عورتیں چونکہ اُس کو اچھی لگتی ہیں اس لئے وہ اُن کی بے حرمتی کرتا ہے۔ بینک میں روپیہ ہو تو اچھے اور شاندار کپڑے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بینک بیلنس خالی ہو تو اچھے اور شاندار کپڑے پہننا ضروری سمجھتا ہے۔

دلّی کے ایک معزز ہندو خاندان کی ایک تعلیم یافتہ نوجوان دوشیزہ

کو اُس سے محبت ہو گئی۔ دیر تک وہ رفیق کو عشقیہ خط لکھتی رہی۔ رفیق بمبئے ہی میں تھا کہ اُس کا ایک ایسا خط آیا کہ رفیق پریشان ہو گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ رفیق اور پریشانی۔ دو متضاد چیزیں؟

رفیق نے مجھے ساری رام کہانی سنائی اور کہا "منٹو، یہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔ میں ایک ہرجائی مرد ہوں۔ مجھے اس افلاطونی محبت سے کیا واسطہ۔ کہتی ہے گھر سے بھاگ کر میرے پاس آجائے گی ——— آجائے، ٹھیک ہے، لیکن میں کب تک اس کی شریف اور پاکیزہ محبت سے چپکا رہوں گا ——— خدا کے لئے تمام شریف عورتیں اپنے گھر میں رہیں۔ شادی کریں، بچّے جنیں اور جائیں جہنّم میں۔ مجھے اُن کا عشق درکار نہیں۔ میری ساری عمر گذر گئی کھوٹے سکّے چلانے۔ کھرے مجھ سے نہیں چلیں گے"

چنانچہ رفیق نے اس مہاراشٹر دوشیزہ کو ایسا دل شکن خط لکھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آگئی۔

رفیق پر یہ میرا مضمون تشنہ ہے۔ مجھے اس کا شدید احساس ہے اُس پر کسی اخبار، رسالے یا کتاب کے لئے جب بھی کوئی مضمون لکھے گا تشنہ ہی رہے گا۔ اس لئے کہ اُس کی ہزار پہلو شخصیت کا احاطہ چند صفحات نہیں کر سکتے۔ زندگی رہی تو میں اپنے تاثرات قلم بند کروں کے

ایک مکمل کتاب کی صورت میں پیش کروں گا۔

آخر میں ایک لطیفہ سُن لیجئے۔

فلم "چل چل رے نوجوان" کے زمانے میں رفیق نے پروڈیوسر ایس مکرجی۔ ڈائرکٹر گیان مکرجی۔ اشوک کمار، سنتوشی، شاہد لطیف اور میری دعوت کی۔ ہم سب رفیق کے مکان واقع شواجی پارک پہنچے۔ رفیق ہلکے ہلکے سرور میں ہارمونیم سامنے رکھے فرش پر بیٹھا تھا۔ پاس ہی شیہداں تھی اور اُس کا بھائی۔ ہم پہنچے تو اُس نے ہمارا استقبال کیا۔ میرا گالیوں سے اور باقیوں کا سلاموں سے۔

شراب کے دو تین دور چلے۔ دوسروں کو اُس نے اسکاچ دی اور مجھے "سولن" کی یعنی دیسی۔ میں خاموش رہا۔ وہ حسبِ عادت بات بات پر مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھانا لگایا گیا۔ حسبِ معمول اُس نے مرغے کے گوشت کے اچھے اچھے ٹکڑے نکال کر اپنی پلیٹ میں رکھ لئے۔

کھانا کھانے کے بعد ایک ایک کرکے سب چلے گئے۔ میں بیٹھا رہا۔ شیہداں اندر جا کے سو گئی۔ رفیق زیادہ پینے کا عادی نہیں۔ وہ پہلے ہی سے بمبئی کی زبان میں "چکار" تھا۔ مرغن کھانوں سے اُس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ میں چپکے سے اُٹھا، دوسرے کمرے میں جا کر ہر ایک

اطمینان سے الماری کھولی اور اسکاچ کی بوتل اٹھا لایا۔ آدھی سے کچھ زیادہ تھی۔ میں آرام سے پیتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے سالے کو بھی دیتا رہا۔ کبھی کبھی رفیق کو بھی اکسا دیتا اور وہ غنودگی کے عالم میں چند شکست بھری گالیاں منہ سے اگل دیتا۔

اب میں نے جو مغلظات بکنا شروع کیں تو رفیق بلبلا اٹھا میری گالیوں کی فہرست کوئی اتنی لمبی چوڑی نہیں۔ دو تین بار منہ بھرا تو ختم ہو گئیں۔ میں نے یہ استادی کی کہ ایک گالی آدھی کہتا اور دوسری آدھی گالی کے ساتھ جوڑ کر لڑھکا دیتا۔ اس ترکیب سے بھی زیادہ دیر تک کام نہ چلا۔ لیکن میں نے سوچا کم بخت کو ہوش کہاں ہے جو الم غلم منہ میں آئے نکال باہر پھینکو۔ چنانچہ میں نے یہی کیا۔ رفیق نشے میں چور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر اس نے مردہ آواز میں کہا۔ "جانے دو منٹو میری جان ——— میں تھک گیا ہوں۔ مجھ میں اب گالیاں دینے کی سکت نہیں ہے۔"

میں بھی تو چاہتا تھا کہ اس میں سکت نہ ہو، ورنہ میں اور اس کے مقابلے کی جرأت کرتا؟

میں نے اس پر یہ مضمون لکھا ہے جسے پڑھ کر وہ یقیناً اپنے مخصوص انداز میں مجھے بڑی نستعلیق گالیاں دے گا ——— لیکن میں لاہور

میں ہوں بدو کراچی میں۔ فی الحال تو محفوظ ہوں۔ لاہور آئے گا تو میں اس کی مغلظات سن لوں گا ۔ پھر اس کی دعوت کروں گا اور جم خانہ وسکی میں اسپرٹ گھول کر...... خود پی لوں گا۔

پارو دیوی

"چل چل رے نوجوان" کی ناکامی کا صدمہ ہمارے دل و دماغ سے قریب قریب مندمل ہو چکا تھا۔ گیان مکرجی، فلمستان کے لئے ایک پروپیگنڈا کہانی لکھنے میں ایک عرصے سے مصروف تھے۔

کہانی لکھنے لکھانے اور اسے پاس کرانے سے پیشتر نلنی جیونت اور اس کے شوہر ورنیدر ڈیسائی سے کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ غالباً پچیس ہزار روپے، ایک سال اس کی میعاد تھی۔ مسٹر ششدھر مکرجی حسبِ عادت سوچ بچار میں دس مہینے گذار چکے تھے۔ کہانی کا ڈھانچہ تھا کہ تیار ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ بصد مشکل جوں توں کر کے ایک خاکہ معرضِ وجود میں آیا جسے گیان مکرجی اپنی جیب میں ڈال کر دہلی روانہ ہو گئے تاکہ زبانی

طور پر اس میں کچھ اور چیزیں ڈال کر حکومت سے پاس کرا لیں۔

خاکہ پاس ہو گیا، جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو ورنیدر ڈیسائی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک برس کا اور کنٹریکٹ کیا جائے۔ اس لئے کہ پہلے معاہدے کی میعاد ختم ہونے والی ہے۔ رائے بہادر چونی لال منیجنگ ڈائرکٹر بڑے اکھڑ قسم کے آدمی تھے، چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ بازی ہوئی۔ فیصلہ ورنیدر ڈیسائی اور ان کی خورد بیوی نلنی کے حق میں ہوا۔ اس طرح پروپیگنڈا فلم جس کی کہانی کا ابھی صرف غیر مکمل خاکہ ہی تیار ہوا تھا پچیس ہزار روپوں کے بوجھ تلے آ گئی۔

رائے بہادر کو بہت عجلت تھی کہ فلم جلد تیار ہو، کیونکہ بہت وقت ضائع ہو چکا تھا، چنانچہ جلدی جلدی میں ولی صاحب کو بلا کر ان کی بیوی ممتاز شانتی سے کنٹریکٹ کر لیا گیا اور اس کو چودہ ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیئے گئے (بلیک میں یعنی بغیر رسید)

دو دن شوٹنگ ہوئی۔ ممتاز شانتی اور اشوک کمار کے درمیان مختصر سا مکالمہ تھا جو بڑی ہین ریہ سل کے بعد فلمایا گیا، مگر جب اسے پردے پر دیکھا گیا تو سب نے ممتاز شانتی کو ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ ممتاز برقع پہن کر آتی تھی اور ولی صاحب نے صاف طور پر مکرجی سے کہہ دیا تھا کہ اس کے جسم کو کوئی ہاتھ نہ لگا

نہیں لگائے گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ممتاز شانتی کو فلم سے علیٰحدہ کر دیا گیا۔ اس بہانے سے کہ جو کردار اسے اس کہانی میں ادا کرنا ہے، اس کے لئے مناسب و موزوں نہیں — کیونکہ اس میں ایسے کئی مقام آئیں گے جہاں ہیروئن کو اپنے جسم کے بعض حصوں کی عُریاں نمائش کرنا پڑے گی — قصہ مختصر کہ یہ چودہ ہزار بھی گئے۔

اب کہانی کا نامکمل ڈھانچہ اُنتالیس ہزار روپے کے نیچے دبا پڑا تھا — رائے بہادر چونی لال، لال پیلے ہو رہے تھے۔ "چل چل رے نوجوان" کی ناکامی نے کمپنی کی حالت بہت پتلی کر دی تھی۔ مارواڑیوں سے قرض لے لے کر گذارہ بصد مشکل ہو رہا تھا۔ رائے بہادر کی خفگی اور پریشانی بجا تھی۔

ایک دن میں، واچا، پائی اور اشوک اسٹوڈیو کے باہر کرسیوں پر بیٹھے کمپنی کی انہی حماقتوں کا ذکر کر رہے تھے جن کے باعث اتنا وقت اور اتنا روپیہ ضائع ہوا، کہ اشوک نے انکشاف کیا کہ جو چودہ ہزار رائے بہادر نے ممتاز شانتی کو دیئے تھے وہ انھوں نے اس سے قرض لئے تھے۔ اشوک نے یہ انکشاف اپنی کالی پنڈلی کو کھجلاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کیا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن فوراً ہی ہم

چپ ہو گئے۔

سامنے بجری بچھی روش پہ ایک اجنبی عورت ہماری بھاری بھر کم ہیئر ڈریسر کے ساتھ میک اپ روم کی طرف جا رہی تھی۔

وِتّارام پاٹی نے اپنے کالے، موٹے اور بدشکل ہونٹ وا کئے اور خوفناک طور پہ آگے بڑھے ہوئے اونچے سیدھے میلے دانتوں کی نمائش کی۔ اور وہ آچا کو کہنی کا ٹھوکا دے کر اشوک سے مخاطب ہوا۔ "یہ — یہ کون ہے؟"

وآچا نے پاٹی کے سر پہ ایک دھول جمائی "سالے تو کیوں پوچھتا ہے —؟"

پاٹی بدلہ لینے کے لئے اُٹھا تو وآچا نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "بیٹھ جا سالے مرت جا اُدھر — تیری تو شکل دیکھتے ہی بھاگ جائے گی۔"

پاٹی اپنے اونچے سیدھے دانت پیستا رہ گیا۔ اشوک جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا، بولا "شکل صورت سے تو اچھی خاصی ہے۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے غور کیا اور کہا "ہاں — نظروں پہ گراں نہیں گزرتی۔"

اشوک میرا مطلب نہ سمجھا "کہاں سے نہیں گزرتی۔"

میں مسکرایا۔" میرا مطلب یہ تھا کہ جو عورت یہاں سے گذر گئی ہے، اسے دیکھ کر آنکھوں پر بوجھ نہیں پڑتا ——— بڑی صاف ستھری ہے لیکن قد کی ذرا چھوٹی ہے۔"

پا ئی نے پھر اپنے دانتوں کی نمائش کی "اوے ——— چلے گی ——— کیوں واچا؟"

واچا، پائی کے بجائے اشوک سے مخاطب ہوا۔" داد امنی! تم جانتے ہو یہ کون ہے؟"

اشوک نے جواب دیا۔" زیادہ نہیں جانتا، مکرجی سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ایک عورت ٹسٹ کے لئے آج آنے والی ہے"

کیمرہ اور ساؤنڈ ٹسٹ لیا گیا جسے ہم سب نے پردے پر دیکھا اور اپنی اپنی رائے دی۔ مجھے، اشوک اور واچا کو وہ بالکل پسند نہ آئی۔ اس لئے کہ اس کی جسمانی حرکات "چوبی" تھیں۔ اس کے اعضا کی ہر جنبش میں تصنع تھا۔ مکالمہ ادا کرتے وقت اس کے ابرو مشینی رقاصاؤں کی طرح ناچتے تھے۔ مسکراہٹ بھی غیر دلکش تھی ——— لیکن پائی اس پر لٹو ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی اور مکرجی سے کہا کہ" ونڈرفل اسکرین فیس" ہے۔

دتا رام پائی، فلم ایڈیٹر تھا۔ اپنے کام کا ماہر، فلمستان چونکہ ایک

ایسا ادارہ تھا جہاں ہر شعبے کے آدمی کو اظہارِ رائے کی آزادی تھی۔ اس لئے دتا رام پائی وقت بے وقت اتی رائے سے ہم لوگوں کو مستفید کرتا رہتا تھا اور خاص طور پر میرے تمسخر سے دو چار ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ لیکن ایس مکرجی نے اس عورت کو جس کا نام پارو تھا، پروپیگنڈا فلم کے ایک رول کے لئے منتخب کر لیا۔ چنانچہ رائے بہادر چونی لال نے فوراً اس سے ایک فلم کا کنٹریکٹ معمولی سی ماہانہ تنخواہ پر کر لیا۔

اب پارو ہر روز اسٹوڈیو آنے لگی۔ بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا جہاں وہ شہر کے قریب قریب تمام رنگین مزاج رئیسوں کی منظورِ نظر تھی۔ ہزاروں میں کھیلتی تھی، پر اسے فلموں میں آنے کا شوق تھا۔ چنانچہ یہ شوق اسے کھینچ کر فلمستان میں لے آیا۔

جب اس سے کھل کے باتیں کرنے کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ حضرت جوش ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔

اس کی زبان بہت صاف تھی، اور جلد بھی، جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چھوٹی آستینوں والے پھنسے پھنسے بلاؤز میں سے اس

کی ننگی باہیں ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں ــــ سفید، سڈول، متناسب اور خوبصورت۔ جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو دیوار لکڑی پر رندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ صبح اسٹوڈیو آتی۔ نہائی دھوئی صاف ستھری، آنچل، سفید یا ہلکے رنگ کی ساری میں ملبوس۔ شام کو جب گھر روانہ ہوتی تو دن گذرنے کے گرد و غبار کا ایک ذرّہ تک اس پہ نظر نہ آتا۔ ویسی ہی تر و تازہ ہوتی جیسی صبح کو تھی۔

دتّا رام پائی اس پر اور زیادہ لٹو ہو گیا۔ شوٹنگ شروع ہوئی نہیں تھی، اس لئے اسے فراغت ہی فراغت تھی، چنانچہ اکثر پارو کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہتا ــــ معلوم نہیں وہ اس کے بھونڈے اور کرخت لہجے، اس کے اوندھے سیدھے میلے دانتوں اور اس کے اَن کٹے میل بھرے ناخنوں کو کیسے برداشت کرتی تھی ــــ صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنا چاہے تو بہت کچھ برداشت کر سکتی ہے۔

پروپیگنڈا فلم کی کہانی کا ڈھانچہ میرے حوالے کیا گیا کہ میں اس کا بغور مطالعہ کروں اور جو ترمیم و تنسیخ میری سمجھ میں آئے بیان کروں میں نے اس ڈھانچے کے تمام جوڑ دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا بے جوڑ ڈھانچہ شاید ہی کسی سے تیار ہو سکے۔ کوئی سر تھا نہ پیر، لیکن

چونکہ میری قابلیت اور ذہانت کا امتحان تھا۔ اس لئے میں نے اپنا ڈھانچہ تیار کیا۔ بڑے خلوص اور بڑی محنت سے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کہ ڈائرکشن کے فرائض ساوک واچا کو سونپے جانے والے تھے جو میرا عزیز دوست تھا۔

نیا ڈھانچہ جب فلمستان کی "ٹل بنچ" کے سامنے پیش ہوا تو میری وہ حالت تھی جو کسی مجرم کی ہو سکتی ہے۔

ایس مکرجی نے اپنا فیصلہ ان چند الفاظ میں دیا۔ "ٹھیک ہے، مگر اس میں اصلاح کی ابھی کافی گنجائش ہے۔"

گیان مکرجی سے پوچھا گیا تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق منہ سکوڑ کر صرف اتنا کہا: "آل موسٹ ٹھیک ہے"۔۔۔ یہ وہ حضرت تھے جو ایس مکرجی کے ڈائرکٹ کئے ہوئے تمام فلموں کے ڈائرکٹر تھے، حالانکہ انھوں نے اپنی زندگی میں ایک فٹ فلم بھی ڈائرکٹ نہیں کی تھی۔

اصل میں فلمستان میں، کام کرنے کا ڈھب ہی نرالا تھا۔ سارا فلم آپ نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ لیکن پردے پر نام میرا دیا جا رہا ہے۔ کہانی ہم نے لکھی ہے، لیکن اس کا مصنف آپ کو بنا دیا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ

دتارام پائی جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ فلمی کہانی کیا ہوتی ہے مجھے مشورے دیا کرتا تھا۔

پروپیگنڈا فلم کی کہانی لکھنے کی دشواریاں کچھ وہی سمجھ سکتا ہے جس نے کبھی ایسی کہانی لکھی ہو۔ سب سے زیادہ مشکل میرے لئے یہ تھی کہ مجھے پارو کو اس کی شکل و صورت، اس کے قد اور اس کی فنّی کمزوریوں کے پیش نظر اس کہانی میں داخل کرنا تھا۔ بہرحال بڑی مغز پاشیوں کے بعد تمام مراحل طے ہو گئے اور کہانی کی نوک پلک نکل آئی اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ہم نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جن مناظر میں پارو کا کام ہے وہ سب سے آخر میں فلمائے جائیں۔ تاکہ پارو فلمی فضا سے اور زیادہ مانوس ہو جائے اور اس کے دل و دماغ سے کیمرے کی جھجک نکل جائے۔

کسی منظر کی بھی شوٹنگ ہو، وہ برابر ہمارے درمیان ہوتی۔ دتارام پائی اب اس سے اتنا کھل گیا تھا کہ باہم مذاق بھی ہونے لگے تھے۔ پائی کی یہ چھیڑ چھاڑ مجھے بہت بھونڈی معلوم ہوتی۔ چنانچہ میں پارو کی عدم موجودگی میں اس کا تمسخر اڑاتا۔ کم بخت بڑی ڈھٹائی سے کہتا "سالے تو کیوں جلتا ہے؟"

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں، پارو بہت ہنس مکھ

اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن سے وہ اونچ نیچ سے بے پروا بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں مقبول ہو گئی۔ نچلے طبقے نے اسے احتراماً پارو دیوی کہنا شروع کر دیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات میں پارو کے بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔

دتّا رام پائی نے ایک قدم اور بڑھایا۔ کچھ ایسی ٹیس لڑائی کہ ایک دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا، پارو سے اپنی خاطر مدارت کرائی اور چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے ہفتے میں ایک دو مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ پارو کے یہاں جا دھمکنا شروع کر دیا۔

پارو اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک مرد رہتا تھا جو قد و قامت میں اس سے دوگنا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پارو کے ساتھ دیکھا ——— وہ اس کا پتی دیو کم اور "تھامو" زیادہ نظر آتا تھا۔

پائی ایسے فخر و ابتہاج سے کنٹین میں پارو سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر نیم عاشقانہ انداز میں کرتا کہ ہنسی آ جاتی۔ میں اور ساوک واچا اس کا خوب مذاق اڑاتے۔ مگر وہ کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پارو بھی موجود ہوتی۔ میں اس کی موجودگی میں بھی پائی کے

خام اور بھونڈے عشق کا مذاق اڑاتا۔ پارو بُرا نہ مانتی اور مسکراتی رہتی اس مسکراہٹ سے اس نے میرٹھ میں جانے کتنے دلوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا ہو گا۔

پارو میں عام طوائفوں ایسا بھڑکیلا یا چھچھورا پن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر بڑی شائستگی سے گفتگو کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرٹھ میں اس کے یہاں آنے جانے والے ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقے سے تھا جو کبھی کبھی ناشائستگی کی طرف محض تفریح کے طور پر مائل ہوا کرتا ہے۔

پارو اب اسٹڈیو کی فضا میں بہت اچھی طرح گھل مل گئی تھی۔ فلمی دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت یا لڑکی نئی نئی ایکٹرس بنتی ہے تو اس کو کوئی نہ کوئی فوراً دبوچ لیتا ہے۔ لیکن پارو کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ فلمستان دوسرے نگار خانوں کے مقابلے میں بہت حد تک "پاکباز" تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پارو کو کوئی اتنی زیادہ جلدی نہیں تھی۔

محسن عبداللہ (پرامرار نینا کا خاوند) اپنی یک آہنگ اختنک مجرد زندگی سے اُکتا کر، پارسی لڑکی ویرا کو جس کی زندگی اسی کی زندگی

کے مانند سپاٹ تھی شریکِ حیات بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اسے ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا چھوڑنا پڑا، کیونکہ وہ تیرا فرسٹ کلاس میں آتی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس کو 'ایٹی کیٹ' کے مطابق آتے جاتے اس کی کتیا کی زنجیر تھامنا پڑی۔ —— عاشقوں کے امام میاں مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی کتیا عزیز تھی۔

داچا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے تازہ تازہ اپنی بدکار فرانسیسی بیوی سے نجات حاصل کی تھی۔ ایس نکرجی، پری چہرہ نسیم بانو کے چکر میں تھا۔ گیان نکرجی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا —— اپنے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کی جلد بہت پسند تھی۔ ایک دن میں نے شاہد لطیف سے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا ”جلد پسند ہے، ٹھیک ہے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اندر کتاب کیسی ہے، مضمون کیسا ہے۔“

پارو کی حالت اب بہت زیادہ مضحکہ خیز ہو گئی تھی اس لئے کہ پارو نے ایک روز اسے اپنے گھر مدعو کیا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے دو پیگ جونی واکر وسکی کے پلائے تھے۔ جب اس کو بہت زیادہ نشہ ہو گیا تھا تو پارو نے اس کو بڑے پیار سے اپنے صوفے پر لٹا دیا تھا —— اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس پر مرتی ہے اور یہ ہم

لوگ چونکہ ناکام رہے ہیں اس لئے حسد کی آگ میں جلتے ہیں ——
اس بارے میں پارو کا ردِ عمل کیا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں۔

شوٹنگ جاری تھی۔ دیرا فلم کی ہیروئن تھی۔ سائڈ ہیروئن کا رول پارو کو ادا کرنا تھا۔ اسے برما کے کسی آزاد جنگلی قبیلے کی ایک شوخ و شنگ، تیز و طرار لڑکی کا روپ دھارنا تھا۔ جوں جوں اس کے مناظر کے فلمائے جانے کا وقت قریب آگیا میرے اندیشے بڑھتے گئے مجھے ڈر تھا کہ وہ امتحان میں پوری نہیں اترے گی اور ہم سب کی کوفت کا موجب ہو گی۔

آخر وہ دن آگیا جب اس کا پہلا "شوٹنگ ڈے" تھا میک اپ اور کسٹیوم سے مزین ہو کر اسے کیمرے کے سامنے لایا گیا۔ عجیب و غریب تراش کی بھڑکیلے رنگوں والی پھنسی پھنسی چولی، ناف سے اور پیٹ کی ہلکی سی جھلک، گھٹنوں سے بالشت بھر اوپر لہنگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیمرے، مائک اور خیرہ کن روشنیوں سے قطعاً مرعوب یا خائف نہیں۔ مکالمہ اس کو اچھی طرح یاد کرا دیا گیا تھا امید تھی کہ بول جائے گی۔ مگر جب ٹیک کا وقت آیا تو اس کا سارا وجود لکڑی ہو گیا۔ منہ کھولا تو مکالمہ سپاٹ، کئی ریہرسلیں کرائی گئیں مگر اس لکڑی میں جان کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح

اپنے ابرو نچاتی تھی جیسے بھاؤ بتا رہی ہے۔ تین چار ریٹیک ہوئے تو میں بالکل مایوس ہو گیا۔ واچا طبعاً بہت جلد گھبرا جانے والا ہے کہ اس اونٹنی کی کوئی کل سیدھی نہیں تو اس نے ایس مکرجی سے کہا کہ وہی اس کو ٹھیک کرے۔

مکرجی اس کو کیا ٹھیک کرتا۔ وہ بنی ہی کچھ ایسے آب و گل سے تھی جس میں بتا دے اور بھاؤ کوٹ کوٹ کے بھرے تھے۔ چنانچہ ایک ریٹیک، میں اس نے کسی قدر گوارا ایکٹنگ کیا تو مکرجی نے غنیمت سمجھ کر صاد کر دیا۔

ہم سب نے بڑی کوشش کی کہ اس کا تصنع اور چوبی پن کسی نہ کسی حیلے دور ہو جائے، مگر ناکام رہے۔ شوٹنگ جاری رہی اور وہ بالکل نہ سدھری۔ اس کو کیمرے اور مائک کا کوئی خوف نہیں تھا۔ مگر سیٹ پر وہ حسبِ منشا اداکاری کے جوہر دکھانے سے قاصر تھی —— اس کی وجہ میرٹھ کے مجروں کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہمیں اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کسی نہ کسی روز منجھ جائے گی۔

چونکہ مجھے اس کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی تھی اس لئے میں نے اس کے رول، میں کتر بیونت شروع کر دی تھی۔ میری اس چالاکی، کا علم اسے پاکی کے ذریعے سے ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خالی

اوقات میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ گھنٹوں بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ بڑے شائستہ انداز میں، مناسب و موزوں الفاظ میں جن میں چاپلوسی کا رنگ نہیں ہوتا، میری تعریف کرتی۔

ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اپنے گھر پہ مدعو بھی کیا۔ میں شاید چلا جاتا، لیکن ان دنوں بہت مصروف تھا۔ ہر وقت میرے اعصاب پر پروپیگنڈا فلم کا منظر نامہ سوار رہتا تھا۔ یوں تو میرا ہاتھ بٹانے کے لئے تین آدمی موجود تھے۔ راجہ مہدی علی خاں ——— محسن عبداللہ اور ڈکشنٹ ———

راجہ مہدی علی خان نے تعاون سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر وقت اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو خط لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ محسن عبداللہ وترا سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے میں مشغول اور مسٹر ڈکشنٹ، پارو کو مکالمے یاد کرانے رہتے تھے۔

میں کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا کہ پارو اور اشوک سیٹ پر جب آمنے سامنے آتے ہیں اور پارو کو اپنے عاشقانہ عشق کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں اشوک کی آنکھوں میں گڑ جانا چاہتی ہیں ——— جیسے اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دیکھو جو کچھ یہ ہو رہا ہے جھوٹ نہیں سچ ہے۔

اشوک طبعاً بہت جھینپو قسم کا آدمی ہے۔ وہ کسی عورت کے کھلم کھلا اظہارِ عشق کو برداشت نہیں کر سکتا ـــــ یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند ہے، لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر لیتا ـــــ اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں لڑکیاں آئیں ـــــ وہ لارڈ بائرن بن سکتا تھا مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے پھنس جانے والی تتلیوں سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا رہا۔

اشوک کمار کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی بھی ایکٹرس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا، بڑی آسانی سے، کئی ایکٹریسیں اپنا دل اس کے قدموں میں ڈال دینے کے لئے تیار تھیں۔ میں نے سوچا اگر پارو کے دل میں بھی کھد بد ہو رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ـــــ پھر پارو تو وارد تھی۔ خود کو اشوک کے ساتھ ملساک کر کے وہ بامِ شہرت پر بڑی جلدی پہنچ سکتی تھی۔

فلم میں پارو کا رول ایک آزاد قبیلے کی نیم جنگلی، خود سر اور جارحانہ قسم کا عشق کرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اشوک سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ ویرا کے عشق میں گرفتار تھا۔ یہ فلمی تثلیث پارو کے اندرونی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کافی سامان بہم پہنچا رہی تھی۔

شوٹنگ جاری تھی۔ ان ڈور، آؤٹ ڈور ——— ایک دن کشتیوں کا سین فلمایا جانے والا تھا۔ اس کے لئے بہت دور ایک کھاڑی منتخب کی گئی۔ دو کشتیاں تھیں۔ ایک میں اشوک کو سوار ہونا تھا، دوسری میں پارو کو ——— اسے یہ ہدایت تھی کہ جب اس کی کشتی، اشوک کی کشتی کے پاس پہنچے تو وہ اس میں کود جائے۔

پانی بہت گہرا تھا۔ حسب ہدایت پارو، اشوک کی کشتی میں کودی۔ مگر ایسا کرتے ہوئے دونوں کشتیوں میں فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا اور وہ پانی میں گر پڑی، او اچا مدد کے لئے چلّایا، فوراً ساحل پر سے دو تین مچھیرے پانی کے اندر گھسے اور پارو کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔

عورت ذات، مگر حیرت ہے کہ اس حادثے نے اسے بالکل خوفزدہ نہیں کیا تھا ——— کپڑے خشک ہوئے تو وہ فوراً دوسرے ٹیک کے لئے تیار تھی۔

جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی تو میں نے اور اشوک نے اس کی ٹانگ کی ایک جھلک دیکھی جو کافی دلچسپ اور شریر تھی۔ جب ہم لوکیشن سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں اشوک نے مجھ سے کہا، "منٹو ——— ! ٹانگ بڑی اچھی تھی، جی چاہتا تھا روسٹ بنا کے کھا جاؤں!"

عجیب بات ہے کہ اشوک جیسا ڈرپوک اور جھینپو اندرونی طور پر سادیت پسند تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چونکہ اپنے جذبات دبا دینے کا عادی تھا۔ اس لئے ردِ عمل کی صورت میں سادیت پیدا ہو گئی تھی۔

ٹوسیٹر ایلم جی کار میں اشوک اور میں دونوں اسٹوڈیو سے گھر واپس جایا کرتے تھے اور راستے میں اِدھر اُدھر کی مختلف باتیں کیا کرتے تھے ——— موٹر اس سڑک پر سے بھی گزرتی تھی جس سے ملحقہ گلی میں پارو کا فلیٹ تھا۔ ایک شام جب ہم وہاں سے گزرے تو تھوڑی دُور آگے نکل کر اشوک نے موٹر روک لی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

مڑ کر اشوک نے اس گلی کی طرف دیکھا اور کہا "آج ہولی کی خوشی میں پارو نے دعوت دی ہے ——— جاؤں یا نہ جاؤں؟"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا "جاؤ!"

"تو چلو، تم بھی چلو!"

میں نے کہا "میں کیوں جاؤں ——— مجھے اس نے مدعو نہیں کیا"

"کوئی بات نہیں ———!" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے موٹر گھمائی اور پارو کے فلیٹ کے پاس یہ رکھ لگائی۔ ہارن بجایا تو بالکنی

میں واچا اور پائی نمودار ہوئے۔

پائی نے مجھے دیکھا تو اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"ارے ــــ تم بھی آگئے!"

واچا نے اشوک سے کہا: "آؤ دادا منی آؤ ــــ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔"

پارو خلافِ معمول بنارسی ساڑھی میں ملبوس دلہن سی بنی بیٹھی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اُٹھ کر استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں معذرت کی کہ وہ مجھے مدعو کرنا بھول گئی۔

فوراً شراب کا دَور شروع ہو گیا۔ پہلا پیگ ختم ہوا تو پائی جھومنے لگا۔ واچا نے فرمائش کی کہ ایک آدھ گانا ہو جائے۔ پارو نے چنچلیاں کھانے والی نگاہوں سے اشوک کی طرف دیکھا اور کہا: "کیوں اشوک صاحب! آپ کچھ سنیں گے؟"

اشوک جھینپ گیا اور اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں صرف اتنا کہہ سکا: "آپ گائیں گی تو میں سنوں گا۔"

گانا شروع ہوا۔ بازاری قسم کی ٹھمری تھی۔ اس کے بعد ایک غزل ہوئی۔ پھر کوئی فلمی گیت۔ اس دوران میں پارو کا شوہر، جو کوئی بھی

وہ تھا گلاسوں میں شراب اور سوڈا انڈیلتا رہا۔ دوسرے پیگ کے بعد پاتی کی آنکھیں مُندنے لگیں۔ اشوک زیادہ پینے کا عادی نہیں اس لئے وہ ڈیڑھ پیگ سے آگے نہ بڑھا۔ واچانے تیسرے پہا پنے گلاس کا منہ بند کر دیا۔

ٹھمریاں، غزلیں، گیت بہت دیر تک ہوتے رہے۔ آخر میں جب اس نے بھجن سنایا تو اس نے میری موجودگی کا احساس کر کے ایک نعت شروع کی، لیکن میں نے فوراً اس کو روک دیا۔ "پاروتی دیوی! یہ محفلِ نشاط ہے ـــــ شراب کے دَور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔"

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور مجھ سے معافی کی طلبگار ہوئی۔

کھانا بہت اچھا تھا ـــــ اشوک جلدی فارغ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دُھلوانے کے لئے پاروتی اُٹھی ـــــ جب اشوک واپس آیا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی اس نے رخصت چاہی اور مجھے ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا۔

راستے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شوٹنگ بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی ـــــ

ایک شام جب میں اور اشوک واپس گھر جا رہے تھے تو شیواجی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا، اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو! تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں؟"

اس کے لہجے میں کسی قدر کپکپاہٹ تھی۔

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے۔ "بتاؤ!"

اشوک ہنسنے لگا۔ "تمہیں یاد ہے، اس روز جب ہم پارو کے ہاں کھانا کھا رہے تھے، تو وہ میرے ہاتھ دھلوانے کے لئے اٹھی تھی ——!"

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آگئی۔ "ہاں ہاں!"

"جب غسلخانے میں اس نے مجھے تولیہ دیا تو مجھ سے آہستہ سے کہا، کل آپ اکیلے آئیے —— شام کو ساڑھے چھ بجے —— میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر باہر نکل آیا۔" اشوک نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھیرا لی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم گئے؟"

"ہاں ——!" اشوک نے اسٹیرنگ ویل سے ہاتھ ہٹائے اور انہیں زور زور سے ملنے لگا۔ "لیکن وہاں سے بھی بھاگ آیا۔"

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ "ہوا کیا —— پورا ایپیسوڈ بتاؤ!"

"میں بڑا ڈرپوک ہوں —— جانے مجھے ایسے موقعوں پہ کیا ہو جاتا ہے —— اس نے مجھے صوفے پہ بٹھایا۔ آپ قالین پہ میرے ساتھ لگ کر

بیٹھ گئی - دو پیگ مجھے پلائے - خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر ـــ پھر وہ لگی اپنی محبت دکھانے ـــ میں سنتا رہا اور کانپتا رہا جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا ـــ اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن فوراً کہیں غائب ہو گئے ـــ وہ مسکرانے لگی......

بھیا اشوک! میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی ـــ میں نے یہ سنا تو چکرا گیا - اٹھا تو اس نے پھر کہا، اشوک صاحب! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں ـــ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا ـــ کار میں بیٹھا ـــ گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے بڑا افسوس ہوا ـــ کیا ہرج تھا اگر میں ـــ" اشوک کے لہجے میں تاسف تھا -

میں نے کہا یہ ہاں کوئی ہرج نہیں تھا"

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہو گیا "اور ـــ مجھے وہ پسند بھی تھی!"

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آگیا جو اس دفعہ کے روز رات کو نو بجے اسٹڈیو کے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا - جشن مسرت میں لوگ ناچ گا رہے تھے ـــ اشوک اپنی ہیروئن دیرا کی باہوں میں باہیں ڈالے محو رقص تھا اور پارو ایک طرف مجسمہ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی ـــ!

انور کمال پاشا

اگر کسی اسٹوڈیو میں آپ کو کسی مرد کی بلند آواز سنائی دے۔ اگر آپ سے کوئی بار بار ہونٹوں پہ اپنی زبان پھیرتے ہوئے بڑے اونچے سُر دل میں بات کرے، یا کسی محفل میں کوئی اس انداز سے بول رہے ہیں جیسے وہ سانڈے کا تیل بیچ رہے ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ وہ حکیم احمد شجاع صاحب کے فرزند نیک اختر مسٹر انور کمال پاشا ہیں۔

انور کمال پاشا کا نام جب میں نے پہلی مرتبہ کسی اخبار میں دیکھا تو میرا دماغ اس انور پاشا کی طرف چلا گیا جو "ترکیہ" کا ہیرو تھا۔ بچپن میں ہم یہ پنجابی گانا گایا کرتے تھے

مصطفےٰ پاشا کمال مُرے تیریاں دُور بلایاں
کہ بکرے یونانی حلال وے بیا وانگ قصائیاں
نال تیرے ہووے انور دی گھوڑی
اگے یاد نہیں رہا کیا تھا۔

مصطفےٰ پاشا کمال اور انور پاشا دونوں نے مل کر ہزاروں یونانی بکرے حلال کئے۔ لیکن بعد میں اُن دونوں میں چپقلش شروع ہو گئی اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

میرا خیال ہے انور کمال پاشا نے ان دونوں شخصیتوں کو ذہنی طور پر متحد کرنے کے لئے یہ نام اختیار کیا۔ ہو سکتا ہے، کوئی اور مصلحت پیش نظر رہی ہو۔

لیکن اگر آپ انور کمال پاشا صاحب کو دیکھیں، تو اُن میں نہ تو مصطفےٰ کمال پاشا سا بھیڑیا پن (مورخ کمال اتاترک کو "گرے ولف" کہتے تھے) اور نہ انور پاشا کا سا بانکپن ..... وہ میرا مطلب ہے انور کمال پاشا، یا تو بھیڑیئے بننے کی کوشش میں بھیڑ بن کر رہ گئے ہیں۔ یا حسین بننے کی کوشش میں تھک ہار کر اپنے ہی خد و خال پر قناعت کر گئے ہیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو۔ قیاس آرائیوں سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

انور کمال پاشا کی شخصیت منفرد ہے۔ وہ انور پاشا کی آنکھوں کا بھیڑیا پن نہیں۔ تو ان میں ایک ہلکی سی چمک ضرور ہے۔ جو ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتے ہیں۔

جسمانی قوت تو خیر اُن میں اسی قدر ہو گی، جتنی میرے جسم ناتواں میں ہے مگر وہ میری طرح دھونس جما کر اس کمی کو پورا کر ہی لیتے ہیں۔

علمی دُنیا میں دراصل بلند بانگ دعوے ہی با اثر ثابت ہوتے ہیں۔ ایک محاورہ ہے "پدرم سلطان بود"! لیکن اس کے برعکس انور کمال پاشا ہمیشہ یہ کہتے سُنے گئے ہیں، کہ میرا باپ سلطان نہیں گذرا یا تھا سلطان تو میں ہوں۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ نفی اکثر اوقات کارگر اور با اثر ثابت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انور کمال پاشا نفسیات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اسی لئے وہ اس گُر کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی ہے۔ لیکن اُن کا اُلو سیدھا ہوتا رہا ہے۔

وہ اپنے باپ کے ناخلف بیٹے نہیں۔ لیکن دنیوی کاروبار کیلئے دوسروں پر اپنا رُعب جمانے کے لئے شاید وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ حسب ضرورت اپنے والد محترم کے متعلق یہ کہہ دیں کہ وہ تو جاہل مطلق ہیں اور اُن کے والد محترم کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ ہزار طرح

پاپڑ بیلنے کے بعد اتنا جان گئے ہیں۔ کہ میرا فرزندِ نیک اختر مجھے جاہلِ مطلق بنا کر ایک ایسی سیڑھی تعمیر کر رہا ہے، جس کے ذریعہ سے اُسے بامِ عروج پر پہنچنا ہے۔

ابھی اس سیڑھی کے تمام زینے مکمّل نہیں ہوئے۔ لیکن اُمید ہے کہ جلد ہو جائیں گے۔ اس لئے انور کمال پاشا بہت ممکن ہے کسی رستے کو کھڑا کر کے، عرش تک پہنچ جائے۔ اور نامکمّل سیڑھی کو حیرت زدہ چھوڑ جائے۔

اس میں شعبدہ بازی کے جراثیم موجود ہیں۔ جس طرح مداری اپنے منہ سے فٹ بال کی جسامت کے بڑے بڑے گولے نکالتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی کوئی اس قسم کا سٹنٹ کر سکتا ہے۔

لیکن مجھے حیرت ہے اور یہ حیرت اس لئے کہ وہ چالاک نہیں۔ عیّار نہیں۔ دغا باز نہیں۔ لیکن پھر بھی جب لوگ اس کے منہ سے فٹ بال جتنے گولے باہر نکلتے دیکھتے ہیں۔ تو کچھ عرصے کے لئے اس کی ساحری سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے، بعد میں وہ اپنی حماقت پہ افسوس کریں کہ یہ تو محض فریبِ نظر تھا۔ یا گولے نکالنے میں کوئی خاص ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ انور کمال پاشا اس دوران میں کوئی اور شعبدہ

ایجاد کر لیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنا دوسرا فلم بنانے کے لئے سرمایہ دار دل سے، بہت ممکن ہے یہ کہہ رہا ہو: کریں اب کے ایسا فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں، جو ہالی ووڈ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس میں کوئی ایکٹر ہوگا، نہ ایکٹریں صرف کاٹھ کی پتلیاں ہوں گی جو بولیں گی۔ گانا گائیں گی اور ناچیں گی بھی ——— اور کلائمکس اس کا یہ ہوگا کہ وہ گوشت پوست کی بن جائیں گی۔

انور کمال پاشا پڑھا لکھا ہے۔ ایم اے ہے۔ انگریزی ادب سے اُسے کافی شغف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ وہ اپنے فلموں کی کہانی اسی سے مستعار لیتا ہے اور حسبِ ضرورت یا حسبِ لیاقت اُردو زبان میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کے فلموں کے کردار ہمیشہ ڈرامائی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خود ڈرامائی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے کہ اُس کے والد محترم جناب حکیم احمد شجاع صاحب کسی زمانے میں اچھے خاصے ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ "باپ کا گناہ" بہت مشہور ہے۔

ایک لطیفہ سنیئے۔ انور کمال پاشا کے متعلق کسی جگہ گفتگو ہو رہی تھی۔ اس دوران میں ایک صاحب نے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا کہا "جی،

ہیں انور صاحب کو جانتا ہوں، وہ باپ کا گناہ ہیں۔"

انور کمال پاشا، بہرحال بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اتنا بولتا۔ اتنا بولتا ہے۔ کہ اُن کے مقابلے ہیں اللہ کوئی نہیں بول سکتا۔ اصل میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی آواز خود سُننا چاہتا ہے اور دل ہی دل میں داد دیتا ہے۔ کہ واہ انور کمال، تو نے آج کمال کر دیا۔ تیرے مقابلے میں اور کوئی اتنا زبردست مقرر نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ انسانی نفسیات کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض انسانوں کو یہ مرض ہوتا ہے کہ وہ ریکارڈ بن جائیں، اور اُسے گراموفون کی سوئی تلے رکھ کر ہر وقت سُنتے رہیں۔ انور کمال پاشا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

اس کے پاس اپنی گفتگوؤں کے کئی ریکارڈ ہیں۔ جو اپنی زبان کی سوئی کے نیچے رکھ کر بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب سارے ریکارڈ بج چکتے ہیں تو وہ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام سُننے والے بچوں کے مانند خوش ہو کر محفل سے چلا جاتا ہے۔

اس کے خیالات ہیں "FIOCOATIAN" کو بہت زیادہ دخل ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ یہ کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ اس کے اکثر فلموں ہیں دریا ضرور نظر آئے گا۔ اُس ہیں ضرور کوئی ڈوبے گا۔ اس

نے اب تک مندرجہ ذیل فلم بنائے ہیں۔ جن میں سے کچھ کامیاب رہے۔
اور کچھ ناکام۔

"دو آنسو"۔ "دلبر"۔ "غلام"۔ "گبھرو" اور "گمنام"۔

اگر آپ نے یہ فلم دیکھے ہیں۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ
ان میں کتنے فلموں میں دریا آتا ہے، جس میں اس کی کہانیوں کے
کردار گرے ہیں۔ لیکن وہ موت کا قائل نہیں۔ وہ ان کو دریا میں گرانا
ضرور ہے، مگر بعد میں بتاتا ہے کہ وہ ڈوبا نہیں تھا۔ یعنی مر نہیں گیا
تھا کسی نہ کسی ذریعے سے (انور کمال پاشا کے اپنے دماغ کی عجیب و
غریب تخلیق ہوتا ہے) زندہ رہا تھا۔

معلوم نہیں، میں کہاں تک صحیح ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انور کمال
پاشا کی زندگی بھی شاید ڈوب ڈوب کر زندہ رہنے سے دوچار رہی ہے۔
اس نے اپنی زندگی میں کئی ندیاں پار کی ہیں۔ ایک تو وہ تھی جو
سہرے جلوے کی بیاہی ہوئی تھی۔ اس کو پار کرنے میں تو خیر اس کو کوئی
دقت محسوس نہ ہوئی ہو گی۔ مگر جب اس کے سامنے وہ ندی جس کا نام
شمیم تھا۔ بمبئی سے بہتی ہوئی لاہور آئی، تو اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا
پڑا۔ لیکن وہ ماہر تیراک کے مانند اسے بھی پار کر گیا۔

اس کو بہت دیر سے فلم بینی کا شوق تھا۔ بعد میں یہ شوق اس

دھن میں تبدیل ہو گیا۔ کہ وہ ایک فلم بنائے۔ جب شمیم سے اس کی راہ و رسم ہوئی۔ تو اُس نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ اور لاؤڈ اسپیکر بن کر ہر طرف گونجنے لگا" کہ آؤ میں فلم بنانا چاہتا ہوں۔ ہے کوئی سخی ایسا جو مجھے سرمایہ دے"

اس کی مسلسل صدا پر آخر کار اسے سرمایہ مل گیا۔ شمیم بمبئی میں ایک ایسی ندی تھی۔ جس کا پانی بہت صاف ستھرا تھا۔ اس میں کئی غوّاص تیر چکے تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ پانی پتھر کی طرح ٹھیر گیا۔ اس لئے تیراکوں کے لئے وہ دلچسپی کا سامان نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنے وطن لاہور میں آنا پڑا۔

خیر اس قصے کو چھوڑیئے۔ یہ کوئی اصول اور لگا بندھا قاعدہ تو نہیں۔ لیکن عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ فلم ڈائرکٹر، عورت کے ذریعے ہی سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور پیچھے بھی اس کی وجہ سے ہٹتے ہیں۔ اور ایسے ہٹتے ہیں۔ یا ہٹائے جاتے ہیں۔ کہ اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

پاشا نے تھوڑی دیر کے بعد شمیم سے شادی کر لی جو اپنا ننگ ڈھانکنا تھا۔ جوڑا کرنے کے لئے قریب قریب ہر روز اپنے بال کھینچنے سے نوچتی رہتی تھی۔ پاشا نے اس کی خوشنودی خاطر کے لئے ضرور مصنوعی طور پر

اپنے سارے پر دبال نوچ کے اُس کے سامنے، پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیئے ہوں گے۔

میں اب لمبے مضمون کو مختصر کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ میں انور کمال پاشا کی طرح طوالت پسند ہونا نہیں چاہتا۔ وہ بہت دلچسپ شخصیت کا مالک ہے اور اس شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ہٹ دھرم بھی ہے اور تلوّن مزاج بھی۔ بکواسی بھی اور بعض اوقات سنجیدہ مزاج بھی —

اس کے کردار میں جو میں نے خاص بات دیکھی وہ یہ ہے کہ وہ منطقی ٹھاٹ کا آدمی ہے اس کی طبیعت میں آجائے تو وہ آپ کا منہ موتیوں سے بھر دے گا اور اگر وہ "موڈ" میں نہیں۔ تو وہ آپ سے کوئی بات نہیں کرے گا۔

میں آپ کو اختتامی طور پر ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں آج سے کچھ عرصہ پہلے شاہ نور اسٹوڈیوز میں تھا۔ جہاں انور کمال پاشا اپنے فلم "گمنام" کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ میں اپنے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھا۔ ٹائپ رائٹر میز پر رکھے کچھ سوچ رہا تھا کہ پاشا اپنی کار سے اُترا اور میرے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس

نے مجھ سے کہا۔

"منٹو صاحب میں ایک سخت الجھن میں گرفتار ہوں۔"

میں نے اپنے خیالات جھٹک کر پوچھا۔

"کیا الجھن ہے آپ کو؟"

اس نے کہا: "یہ فلم جو میں بنا رہا ہوں، اس میں ایک مقام پر اٹک گیا ہوں، آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے آپ مشکل کشائی کر سکیں۔"

میں نے اس سے کہا: "میں حاضر ہوں۔ فرمائیے! آپ کہاں اٹکے ہوئے ہیں؟"

اس نے مجھے اپنے فلم کی کہانی سنانا شروع کر دی۔ دو سین تفصیل سے اس انداز میں سنائے۔ جیسے پولیس جیپ میں بیٹھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے راہ چلتے لوگوں کو ہدایت کر رہی ہے۔ کہ انہیں بائیں ہاتھ چلنا چاہیئے۔ میں اپنی زندگی میں ہمیشہ الٹے ہاتھ چلا ہوں، اس لیئے میں نے ہاشا سے کہا۔

"آپ کو ساری کہانی سنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کس گڑھے میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

ہاشا نے حیرت آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھا: "آپ کیسے سمجھ گئے؟"

میں نے اس کو سمجھا دیا اور اس کی مشکل کا حل بھی بتا دیا۔ جب اس نے میری تجویز سنی۔ تو اٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا اس کے بعد اس نے کہا: "ہاں کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے"

میں ذرا چڑ سا گیا "حضرت اس سے بہتر حل آپ کو اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ مصیبت یہ ہے کہ میں فوری طور پر سوچنے کا عادی ہوں —— اگر میں نے یہی حل آپ کو دس یا بارہ روز کے بعد پیش کیا ہوتا۔ تو آپ نے کہا ہوتا کہ سبحان اللہ۔ مگر اب کہ میں نے چند منٹوں میں آپ کی مشکل آسان کر دی ہے۔ تو آپ کہتے ہیں ہاں۔ کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو شاید اس مشورے کی قیمت معلوم نہیں"۔ پاشلنے فوراً اپنے پروڈکشن منیجر کو بلایا۔ اس سے چیک بک لی اور اس پر کچھ لکھا۔ چیک پھاڑ کر بڑے خلوص سے مجھے دیا "آپ یہ قبول فرمائیں"۔ اس کے اصرار پر میں نے یہ چیک لے لیا —— جو پانچ سو روپے کا تھا —— یہ میری زیادتی تھی۔ اگر میں آسودہ حال ہوتا تو یقیناً میں نے یہ چیک پھاڑ دیا ہوتا لیکن انسان بھی کتنا ذلیل ہے یا اس کے حالاتِ زندگی کتنے افسوسناک ہیں۔ کہ وہ گراوٹ پر مجبور ہو جاتا ہے —— !

میں اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں —— انور کمال اپنے سہرے جلوے کی بیاہی بیوی سے بچے پیدا کرتا ہے جن کی نگہداشت شمیم کرتی

ہے ۔ وہ ریل گاڑی ہے جو مسافروں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے ۔ اور انور کمال پاشا انجن ڈرائیور ہے جو اس کے پیٹ میں ایندھن جھونکتا رہتا ہے ۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ریل گاڑی کے انجن کی ایسی سیٹی ہے جو رات کی خاموش فضا میں "فیڈ آوٹ" ہو رہی ہے ۔

کے کے

یہ اُس مشہور ایکٹرس کا نام ہے جو ہندوستان کے متعدد فلموں میں آ چکی ہے۔ اور آپ نے یقیناً اُسے سیمیں پردے پر کئی مرتبہ دیکھا ہو گا۔ میں جب بھی اُس کا نام کسی فلم کے اشتہار میں دیکھتا ہوں، تو میرے تصور میں اُس کی شکل بعد میں، لیکن سب سے پہلے اُس کی ناک اُبھرتی ہے —— تیکھی، بہت تیکھی ناک۔ اور پھر مجھے بامبے ٹاکیز کا وہ دلچسپ واقعہ یاد آجاتا ہے، جو میں اب بیان کرنے والا ہوں۔

بٹوارے پر جب پنجاب میں فسادات شروع ہوئے، تو کلدیپ کور جو لاہور میں تھی، اور وہاں فلموں میں کام کر رہی تھی، ہجرت کر کے بمبئی چلی گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کا داشتہ پران بھی تھا، جو پنچولی کے کئی فلموں میں کام کر کے

شہرت حاصل کر چکا تھا۔

اب پران کا ذکر آیا ہے، تو اُس کے متعلق بھی چند تعارفی سطور رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پران اچھا خاصا خوش شکل مرد ہے۔ لاہور میں اُس کی شہرت اس وجہ سے بھی تھی، کہ وہ بڑا ہی خوش پوش تھا۔ بہت ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ اُس کا ٹانگہ گھوڑا، لاہور کے رئیسی ٹانگوں میں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھا۔

مجھے معلوم نہیں، پران سے کلدیپ کور کی دوستی کب اور کس طرح ہوئی۔ اس لیے کہ میں لاہور میں نہیں تھا۔ لیکن فلمی دُنیا میں دوستیاں عجائب میں داخل نہیں۔ وہاں ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ایکٹرسوں کا دوستانہ بیک وقت کئی مردوں سے ہو سکتا ہے۔ جو اس فلم سے وابستہ ہوں۔

جن دنوں پران اور کلدیپ کور کا معاشقہ چل رہا تھا۔ ان دنوں شیام مرحوم بھی وہیں تھا۔ پونہ اور بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا تھا۔ جس سے اسے والہانہ محبت تھی۔ عشق پیشہ انسان تھا اور کلدیپ بھی اس میدان میں اُس سے پیچھے نہیں تھی ـــــ دونوں کا تصادم ہوا۔ قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے کہ ایک اور لڑکی شیام کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

اس کا نام ممتاز تھا جو تاجی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن تھی۔ کلدیپ کو شیام کی یہ قلابازی پسند نہ آئی چنانچہ وہ

اُس سے ناراض ہو گئی۔ اور ہمیشہ ناراض رہی۔ میں یہاں آپ کو یہ بتا دوں کہ کلدیپ بڑی ہٹیلی عورت ہے۔ جو بات اس کے دماغ میں سما جائے اس پر اڑی رہتی ہے۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ یہ واقعہ بمبئی کا ہے۔

ہم تینوں بمبئی ٹاکیز میں تھے اور شام کو برقی ٹرین سے اپنے گھر جا رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اس دن قریباً قریباً خالی تھا۔ ہم تینوں کے سوا اس میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔

شیام طبعاً بڑا بلند بانگ اور منہ پھٹ تھا جب اُس نے دیکھا کہ کمپارٹمنٹ میں کوئی غیر نہیں تو اُس نے کلدیپ کور سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ رشتہ جو لاہور میں قائم ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اب یہاں بمبئی میں قائم ہو جائے۔ کیونکہ تاجی سے اُس کی کھٹ پٹ ہو گئی تھی رمولا کلکتہ میں تھی اور نگار سلطانہ نغمہ نویس مدھوک کے پاس۔ وہ ان دنوں بقول اس کے "خالی ہاتھ" تھا۔

چنانچہ اُس نے کلدیپ کور سے کہا کہ تم مجھ سے دُور دُور کیوں رہتی ہو ادھر آؤ میری جان میرے پاس بیٹھو۔ کلدیپ کی ناک اور تیکھی ہو گئی۔

"شیام صاحب آپ مجھ پر ڈورے نہ ڈالیں"

میں ان کی گفتگو جو مجھے مکمل طور پر یاد ہے یہاں نقل کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ وہ بہت بیباک تھی۔ دبے اس کی روح اپنے لفظوں میں بیان کئے دیتا ہوں

شیام کبھی سنجیدگی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہر لفظ میں ایک قہقہہ ہوتا تھا
اس نے کلدیپ سے اسی مخصوص انداز میں کہا۔ "جان من اس اُلو کے پٹھے پر آن
کر چھوڑ دو اور میرے ساتھ ناطہ جوڑ دو۔ وہ میرا دوست ہے لیکن یہ معاملہ بڑی
آسانی سے طے ہو سکتا ہے"

کلدیپ کور کی آنکھیں اس کی ناک کی طرح بڑی اور تیکھی ہیں۔ اس کا
لب دہان بھی بڑا تیکھا ہے۔ اس کے چہرے کا ہر خدوخال تیکھا ہے جب وہ
اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر بات کرتی ہے۔ تو آدمی بوکھلا جاتا ہے کہ یہ کیا
مصیبت ہے۔

اس نے تیز تیز نگاہوں سے شیام کی طرف دیکھا اور اُس سے زیادہ تیز
لہجے میں اس سے کہا۔ "منہ دھو رکھئیے شیام صاحب" شیام پر عورتوں کی
تیز گفتاری کا بھلا کیا اثر ہوتا اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کے میری
جان تم لاہور میں مجھ پہ مرتی تھیں۔ یاد نہیں تمہیں۔

اب کلدیپ نے قہقہہ لگایا جس میں نسوانی طنز بھرا تھا۔ "آپ کو وہم ہو گیا تھا"
شیام نے کہا۔ تم غلط کہتی ہو تم یقیناً مجھ پہ مرتی ہو۔

میں نے کلدیپ کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر پسپردگی
کی خواہش موجود ہے۔ مگر اس کا ہٹیلا دماغ اس کی اس خواہش کو رد کرنے کی
کوشش میں مصروف ہے چنانچہ اُس نے اپنی تیکھی پلکیں پھڑ پھڑا کر کہا۔
"مرتی تھی لیکن اب نہیں مروں گی"

شیام نے اپنے اسی لاابالیانہ انداز میں کہا۔ اب نہیں مرو گی تو کل

مر و گی ۔ مرنا بہر حال تمھیں مجھ پہ ہی ہے ۔۔

کلدیپ کور بھنا گئی ۔ "شیام تم مجھ سے آج آخری بار سن لو کہ تمھارا میرا کوئی سلسلہ نہیں ہو سکتا ۔ تم اترا تے ہو ۔ ہو سکتا ہے لاہور میں کبھی میری طبیعت تم پر آئی ہو لیکن جب تم نے بے رخی برتی تو میں کیوں تمھیں منہ لگاؤں ۔ اب اس قصہ کو ختم کرو ۔"

قصہ ختم ہو گیا ۔ صرف وقتی طور پر کیونکہ شیام زیادہ بحث بحثی کا عادی نہیں تھا ۔

کلدیپ کور اٹاری کے ایک مشہور و معروف اور مالدار سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس کا ایک فرد لاہور کی ایک مشہور مسلمان عورت سے منسلک ہے جس کو اس نے لاکھوں روپے دیئے اور سنا ہے کہ اب بھی دیتا ہے ۔

یہ مسلمان عورت کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہو گی مگر اب موٹی اور بھدی ہو گئی ہے ۔ مگر وہ اٹاری کے سکھ حضرت اب بھی باقاعدہ یہاں لاہور میں فلیٹی ہوٹل میں آتے ہیں اور اپنی مسلمان محبوبہ کے ساتھ چند روز گذار کر واپس چلے جاتے ہیں ۔

جب بٹوارہ ہوا تو کلدیپ کور اور پرآن کو افراتفری میں لاہور چھوڑنا پڑا ۔ پرآن کی موٹر (جو غالباً کلدیپ کور کی ملکیت تھی) یہیں رہ گئی لیکن کلدیپ کور ایک باہمت عورت ہے ۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے ۔ اس کے لئے وہ کچھ دیر کے بعد لاہور آئی اور فسادات کے دوران میں یہ موٹر خود چلا کر بمبئی لے گئی ۔

جب میں نے موٹر دیکھی اور پرآن سے پوچھا کہ یہ کب خریدی گئی ہے ۔ تو اس نے مجھے سارا واقعہ سنایا کہ کے کے لاہور سے لیکر آئی ہے ۔ اور یہ کہ

راستے میں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ایک صرف دہلی میں اسے چند روز ٹھہرنا پڑا کہ ایک گڑبڑ ہو گئی تھی۔ یہ گڑبڑ کیا تھی اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔

جب وہ موٹر لے کر آئی تو اُس نے سکھوں پر مسلمانوں کے مظالم بیان کئے اور اس انداز سے بیان کئے کہ معلوم ہوتا تھا وہ میز پر سے مکھن لگانے والی چھری اُٹھائے گی اور میرے پیٹ میں گھونپ دے گی۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جذباتی ہو گئی تھی ورنہ مسلمانوں سے کوئی عداوت یا بغض نہیں۔

اصل میں اس کا کوئی مذہب نہیں وہ صرف عورت ہے ایک ایسی عورت جو جسمانی لحاظ سے بڑی پُر خلوص ہے۔

اس کی ناک بیحد تیکھی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ اس کا لب دھان بہت باریک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے چہرے پر ذرا سا چڑھاؤ بہت تیز و تند بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا لہجہ اور اسکی آواز بھی غیر معمولی طور پر تند و طرار ہے۔

کلدیپ کور کی تیکھی ناک کا ذکر میں کئی بار کر چکا ہوں اس سلسلے میں آپ ایک لطیفہ سن لیجئے۔

میں فلمستان چھوڑ کر اپنے دوست اشوک کمار اور ساوک واچا کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا تھا اس زمانے میں فسادات کا آغاز تھا۔ اسی دوران میں کلدیپ کور اور اُس کا داشتہ پران ملازمت کے لئے وہاں آیا۔

پران سے جب میری ملاقات شیام کے توسط سے ہوئی تو میری اُسکی فوراً دوستی ہو گئی۔ بڑا بے ریا آدمی ہے۔ کلدیپ کور سے البتہ کچھ رسمی قسم

کی ملاقات رہی۔

اِن دنوں تین فلم ہمارے اسٹوڈیو میں شروع ہونے والے تھے چنانچہ جب کلدیپ کور نے مسٹر ساوک واچا سے ملاقات کی۔ تو انھوں نے جوزف واشنگ جرمن کیمرہ مین سے کہا کہ وہ اِس کا کیمرہ ٹیسٹ کرے تاکہ اطمینان ہوجائے۔ واشنگ گورے رنگ اور اُدھیڑ عمر کا موٹا سا آدمی ہے، اس کو ہمانسو رائے مرحوم اپنے ساتھ جرمن سے لائے تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اسے دیولالی میں نظر بند کردیا گیا۔ ایک عرصہ تک وہاں رہا۔ جب جنگ ختم ہوئی۔ تو اسے رہا کردیا گیا اور وہ پھر واپس بمبئی ٹاکیز میں آگیا۔ اس لئے کہ مسٹر واچا سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ کیونکہ وہ عرصہ ہوا بمبئی ٹاکیز میں اکٹھے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ان دنوں مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھے۔

واشنگ نے اسٹوڈیو میں روشنی کا انتظام کرایا اور میک اپ مین سے کہا کہ وہ کلدیپ کور کو تیار کرکے کیمرہ ٹیسٹ کے لئے لائے۔ وہ خود تیار تھا۔ کیمرہ تیار تھا۔ اس کو اُس نے اچھی طرح دیکھا۔ روشنیاں درست کرائیں اور اپنا چرٹ سلگائے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

کلدیپ کور آئی میں نے اُسے دیکھا اس کی ناک پر میک اپ مین نے سُرخی اور سفیدے کے کچھ ایسے خط لگائے تھے کہ وہ دس گنا اور نکیلی ہوگئی تھی۔ جب واشنگ نے اس کو دیکھا تو وہ گھبرا گیا کیونکہ وہ سرتاپا ناک تھی۔ کلدیپ کور بالکل بے خوف بے جھجک کیمرے کے سامنے کھڑی ہوگئی

واشنگ نے اب اس کو کبرے کی آنکھ سے دیکھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کو بڑی اُلجھن ہو رہی ہے وہ اس کی ناک ایسے زاویے پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ معیوب معلوم نہ ہو۔

بیچارہ اس کوشش میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ آخر اُس نے تھک ہار کر مجھ سے کہا میں اب ایک کپ چائے پیئوں گا۔ میں سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں کنٹین میں پہنچ گئے وہاں اُس نے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے مجھ سے کہا، مسٹر منٹو اسکی ناک بھی ایک آفت ہے کیمرے میں گھسی چلی آتی ہے۔ چہرہ بعد میں آتا ہے ناک پہلے آتی ہے اب میں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آتا میں نے کہا "تم جانو تمھارا کام جانے۔"

پھر اُس نے ایک اور اُلجھن کا اظہار کیا لیکن وہ میرے کان میں "مسٹر منٹو ــــ اس کا وہ معاملہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن میں اس سے کیسے کہوں اور یہ کہہ کر موٹے واشنگ نے اپنا پسینہ پھر پونچھا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا لیکن واشنگ نے پھر بھی مجھے وضاحت سے سب کچھ بتا دیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں کے کے سے درخواست کروں کہ وہ اس معاملے کو ٹھیک کرے کہ وہ بہت ضروری ہے ناک کا وہ کوئی نہ کوئی زاویہ نکال لے گا، مگر اس معاملے کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ یہ اس کا کام ہے۔ میں نے اس کی تشفی کی کہ میں سب ٹھیک کہہ دوں گا۔ کیونکہ اُس نے مجھے اس معاملے کی درستی کا حل بتا دیا تھا کہ جو پینتیس روپے میں وائٹ وے اینڈ لیڈ لا کی دکان سے دستیاب ہو سکتا تھا۔

اِس روز ٹیسٹ کسی بہانے موقوف کر دیا گیا۔ کلدیپ جب اسٹوڈیو سے باہر نکلی تو میں نے بے تکلفی سے ساری بات جو اِس معاملے کے متعلق تھی بتا دی اور اس سے کہا کہ وہ آج ہی فورٹ میں جا کر وہ چیز خرید لے جس سے اس کے جسم کا نقص دُور ہو جائے گا۔ اس نے بلا جھجک میری بات سُنی اور کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت پران کے ساتھ گئی اور وہ چیز خرید لائی۔ جب دوسرے روز اسٹڈیو میں اس سے ملاقات ہوئی تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ چیزیں ایجاد کرنے والے بھی بلا کے آدمی ہیں۔ جو یوں چٹکیوں میں "معاملوں" کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

واشنگ نے جب اسے دیکھا تو وہ مطمئن تھا۔ گو کلدیپ کی ناک اسے تنگ کر رہی تھی مگر اب دوسرا معاملہ بالکل ٹھیک تھا چنانچہ اُس نے ٹیسٹ لیا اور جب اس کا پرنٹ تیار ہوا اور ہم سب نے اسے اپنے پروجیکشن ہال میں دیکھا تو اس کی شکل و صورت کو پسند کیا گیا اور یہ رائے متفقہ طور پر قائم ہوئی کہ وہ خاص رولز کے لئے بہت اچھی رہے گی خصوصاً ویمپ رول کے لئے۔ کلدیپ کور سے مجھے زیادہ ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پران چونکہ دوست تھا اور اس کے ساتھ اکثر شامیں گزرتی تھیں اس لئے کلدیپ بھی کبھی کبھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتی تھی وہ ایک ہوٹل میں رہتی تھی۔ جو ساحلِ سمندر کے پاس تھا پران بھی اس سے کچھ دور ایک سکویل میں مقیم تھا جہاں اس کی بیوی اور بچہ بھی تھا۔ لیکن اس کا زیادہ وقت کلدیپ کور کے ساتھ گزرتا تھا میں اب آپ کو ایک دلچسپ واقعہ

سُناتا ہوں۔

میں اور شیام تاج ہوٹل میں بیئر پینے جا رہے تھے کہ راستے میں مشہور نغمہ نویس مدھوک سے ملاقات ہوگئی وہ ہمیں "ایروس سینما" کی بار میں لے گئے وہاں ہم سب دیر تک بیئر نوشی میں مشغول رہے۔ مدھوک ٹیکسیوں کا بادشاہ مشہور ہے۔ باہر ایک گرانڈیل ٹیکسی کھڑی تھی۔ یہ مدھوک صاحب کے پاس تین دن سے تھی۔

جب ہم فارغ ہوئے تو اُنھوں نے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ مدھوک صاحب کو اپنی محبوبہ نگار سلطانہ کے پاس جانا تھا جس سے کسی زمانے میں شیام کا بھی تعلق تھا۔ اور کلدیپ کور بھی اس کے آس پاس ہی رہتی تھی۔ شیام نے مجھ سے کہا چلو پرآن سے ملتے ہیں۔

چنانچہ مدھوک صاحب کی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے۔ وہ تو اپنی نگار سلطانہ کے پاس چلے گئے اور ہم دونوں کلدیپ کور کے ہاں۔ پرآن وہاں بیٹھا تھا۔ ایک مختصر سا کمرہ تھا بیئر پی ہوئی تھی۔ غنودگی طاری ہوئی تھی۔ اس کو زائل کرنے کے لئے شیام نے سوچا کہ تاش کھیلنی چاہیئے۔ کلدیپ فوراً تیار ہو گئی لیکن یہ کہا کہ فلش ہوگی۔ ہم مان گئے۔

فلش شروع ہو گئی۔ کلدیپ اور پرآن ایک ساتھ تھے۔ پرآن ہی پتے بانٹتا تھا وہی اُٹھاتا تھا۔ اور کلدیپ اس کے کاندھے کے ساتھ اپنی نوکیلی ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی۔ البتہ جتنے روپے پرآن جیتتا تھا اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی۔

اِس کھیل میں ہم صرف ہارا کئے۔ میں نے فلش کئی مرتبہ کھیلی ہے لیکن وہ فلش کچھ عجیب وغریب قسم کی تھی۔ میرے پچھتر روپے پندرہ منٹ کے اندر اندر کلدیپ کور کے پاس تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج پتوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹھکانے کے آتے ہی نہیں۔

شیام نے جب یہ رنگ دیکھا تو مجھ سے کہا "منٹو اب بند کر دو۔"

میں نے کھیل بند کر دیا۔ پرآن مسکرایا اور اُس نے کلدیپ سے کہا۔ "یہ سب پیسے واپس کر دو منٹو صاحب کے۔"

میں نے کہا یہ غلط ہے۔ تم لوگوں نے جیتے ہیں۔ واپسی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اِس پر پرآن نے مجھے بتایا کہ وہ اوّل درجے کا نوسر باز ہے اُس نے جو کچھ مجھ سے جیتا ہے اپنی چابکدستی کی بدولت مجھ سے جیتا ہے۔ چونکہ میں اس کا دوست ہوں اس لئے وہ مجھ سے دھوکا کرنا نہیں چاہتا۔ میں پہلے سمجھا کہ وہ اس حیلے سے میرے روپے واپس کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب اُس نے تاش کی گڈی اُٹھا کر تین چار بار پتے تقسیم کئے۔ اور ہر بار بڑے داؤ جیتنے والے پتے اپنے پاس گرائے تو میں اُس کے ہتھکنڈے کا قائل ہو گیا۔ یہ کام واقعی بڑی چابکدستی کا ہے۔ پرآن نے پھر کلدیپ کور سے کہا کہ وہ روپے واپس کر دے مگر اُس نے انکار کر دیا شیام کباب ہو گیا۔ پرآن ناراض ہو کر چلا گیا۔ غالباً اُسے اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ شیام اور میں وہیں بیٹھے رہے تھوڑی دیر شیام اس سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر اُس نے کہا آؤ چلو سیر کریں کلدیپ راضی ہو گئی۔

ٹیکسی منگوائی گئی ہم سب بائی کھلہ روانہ ہوئے۔ کلیر روڈ پر میرا فلیٹ تھا ہم سیدھے وہاں پہنچے گھر میں ان دنوں کوئی بھی نہیں تھا۔ شیام میرے ساتھ رہتا تھا۔ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو شیام نے کلدیپ سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ کلدیپ بہت جلد تنگ آنے والی عورت نہیں وہ کسی مرد سے گھبرانی بھی نہیں۔ اس کو خود پر پورا پورا اعتماد ہے۔ چنانچہ وہ دیر تک شیام کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہی۔

ہاں میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا۔ کہ جب ہم کلیر روڈ پر پہنچے تو کلدیپ نے ایک اسٹور کے پاس ٹیکسی روکنے کے لئے کہا کہ وہ سینٹ کی شیشی خریدنا چاہتی ہے۔ شیام سخت کباب تھا کہ وہ اس روپلے سے ہر چیز خریدے گی جو پیرآن نے نو سر بازی کے ذریعے سے مجھ سے جیتے تھے پر میں نے اس سے کہا کوئی ہرج نہیں تم اس بات کا کچھ خیال نہ کرو۔ ہٹاؤ اس قصے کو۔ کلدیپ کے ساتھ میں اسٹور میں گیا اس نے ہاردے کا سینٹ پسند کیا اس کی قیمت بائیس روپے آٹھ آنے تھی۔ کلدیپ نے خوبصورت شیشی اپنے پرس میں رکھی اور مجھ سے کہا منٹو صاحب قیمت ادا کر دیجئے۔

میں اس سینٹ کے دام ہر گز ادا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر دکاندار میرا واقف تھا۔ اور پھر ایک عورت نے اس انداز سے مجھ سے قیمت ادا کرنے کو کہا تھا کہ انکار کرنا مردانہ وقار کی تذلیل کا باعث ہوتا۔ چنانچہ میں نے جیب سے روپے نکالے اور ادا کر دیئے۔ فلیٹ میں جب شیام کو معلوم ہوا کہ سینٹ میں نے خرید کر دیا ہے۔ تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مجھے اور

کلدیپ کور کو پیٹ بھر کر گالیاں دیں۔ لیکن بعد میں نرم ہو گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلدیپ کسی نہ کسی طرح رام ہو جائے۔ میں نے بھی کوشش کی اور کلدیپ کور کو سمجھایا کہ اب اس کے اختلافات مٹ جانے چاہئیں کلدیپ مان گئی میں نے شیام اور اس سے کہا کہ میں جاتا ہوں تم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لو مگر اُس نے کہا کہ نہیں یہ سمجھوتہ اس کے ہوٹل میں ہوگا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ دونوں اس میں چلے گئے۔

میں خوش تھا کہ چلو یہ قصہ طے ہوا۔

مگر پون گھنٹے بعد ہی شیام لوٹ آیا۔ سخت غصے میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے اُسے جب برانڈی کا گلاس پیش کیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ زخمی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ میں نے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھا۔ وہ کباب تھا لیکن برانڈی نے اُس کے موڈ کو کسی قدر درست کر دیا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ کے ساتھ اُس کے ہوٹل میں پہنچا اور وہ ٹیکسی سے باہر نکلے تو وہ زکا۔ دیپ کو گالی دے کر منکر ہو گئی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ ہم دونوں ایک پتھریلی دیوار کے پاس کھڑے تھے میں نے اُس سے کہا۔ تم لاہور میں مجھ پر مرتی تھیں۔ اب یہ کیا نخرہ ہے۔ اُس نے جواب میں کچھ ایسی بات کہی کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے تان کر گھونسہ مارا مگر وہ ــــ ایک طرف ہٹ گئی اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ وہ ہنسی قہقہے لگاتی اُوپر ہوٹل میں چلی گئی اور میں کھڑا اپنا زخمی ہاتھ دیکھتا رہا۔

قلد یپ کور عجیب و غریب شخصیت کی مالک ہے۔ جس طرح اسکی ناک تیکھی ہے اسی طرح اس کا کردار تیکھا اور نوکیلا ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ اس پر ہندوستان میں پاکستان کی جاسوسی کا الزام لگایا گیا ہے معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن میں وثوق سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسی عورت ماتاہری کبھی نہیں بن سکتی جس کا ظاہر باطن ایک ہو۔

○ منٹو پاکستان اور ہندوستان کی ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہے جو مر بھی گئے اور نہیں بھی مرے۔ اس لیے اس کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

ابراهیم جلیس

○ منٹو ایسا نڈر، بے باک، صاف گو افسانہ نگار آج تک اُردو ادب نے پیدا نہیں کیا، اور اس کی موت سے اُردو کا افسانوی ادب مفلس ہو گیا۔

شاهد احمد دهلوی

○ منٹو کا فن اور نقطۂ نظر ہمیشہ اُردو ادب کے پرستاروں میں بحث کا موضوع بنا رہے گا، لیکن ایک بات پر سب متفق ہیں کہ وہ بہت عظیم افسانہ نگار ہیں۔

سید اُحتشام حسین

○ منٹو کے انتخابِ موضوع کے اختلاف کے باوجود میرے نزدیک وہ بہت بڑا فن کار تھا۔

علی عباس حُسینی

○ منٹو عہدِ حاضر کے افسانہ نگاروں کا ذہنی اور تخلیقی رہنما تھا۔

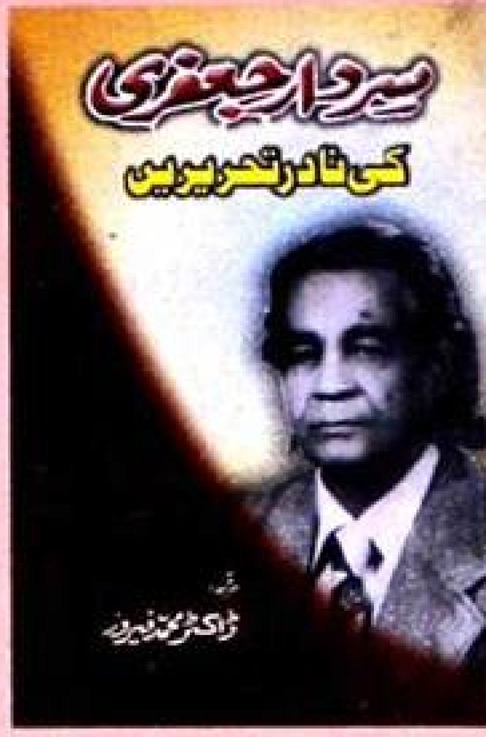
سید ابو الخیر کشفی

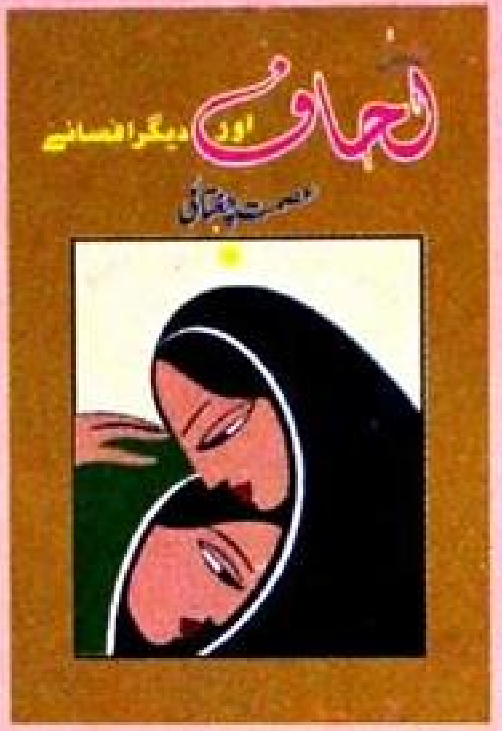
○ منٹو ہمیشہ زندہ رہے گا، اپنی تخلیقات کی وجہ سے۔ منٹو وقت اور زمانے کی دست برد سے بالاتر ہو چکا ہے۔

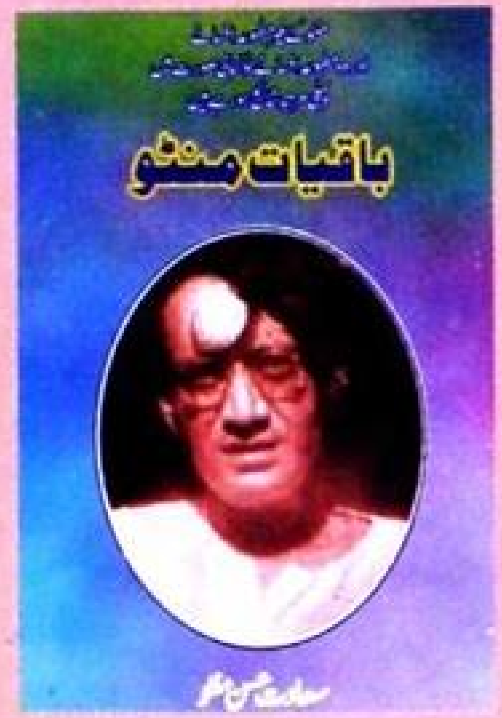
ممتاز مفتی

○ منٹو کا لفظ اب ایک اسم صفت بن گیا ہے۔ اب یہ لفظ ایک خاص ادبی رجحان یا شخصیت کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

حامد جلال

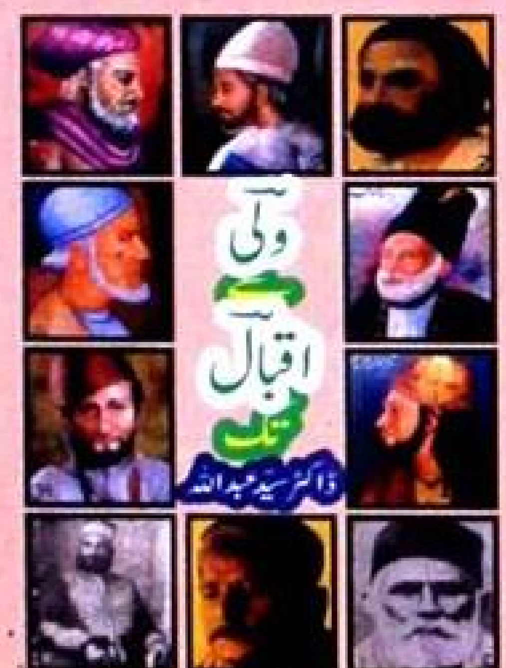

سردار جعفری
کی نادر تحریریں

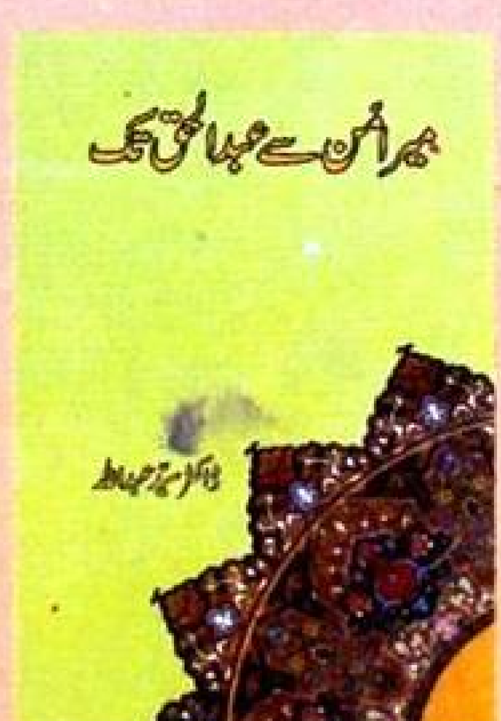

لحاف اور دیگر افسانے
عصمت چغتائی


باقیات منٹو
سعادت حسن منٹو

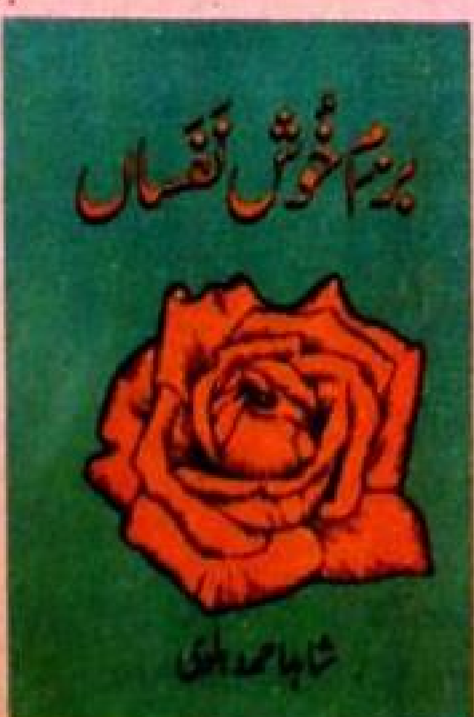

ٹھنڈا گوشت
سعادت حسن منٹو


منٹو کے مضامین


ولی سے اقبال تک
ڈاکٹر سید عبداللہ


میرامن سے عبدالحق تک


دنیا گول ہے
سفرنامہ
ابن انشا


بزمِ خوش نفساں
شاہد احمد دہلوی

ساقی بک ڈپو